جیا قریشی

صبح نو کا موسم

digest novels lovers group ❤️❤️

دروازہ کھولتے ہی اس کا غصہ نقطۂ عروج پر پہنچ گیا، جب اسے جمشید انکل کے مسکراتے چہرے کے پیچھے سے اس کا چہرہ نظر آیا۔

وہ پاؤں پٹختی اندر آئی تھی۔ ''آ گیا منحوس۔'' اس نے دادی کو اطلاع دی۔ اور دادی نے اسے ان نظروں سے

CamScanner

فوراً کو وہ تاب نہ لا کر تیر کی طرح اندر کمرے میں چلی گئی۔ ورنہ دادی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ آنے والوں کے
بے نیاز اس کے بخیے ادھیڑنا شروع کر دیتیں۔
کھڑکی کے پاس بیٹھ کر نووارد کو فوکس کرتے ہوئے وہ اسے زیر لب گالیوں سے نواز رہی تھی۔ جب کہ وہ
ریبواڑے بیٹھا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ارد گرد کا جائزہ لینے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ دادی اپنی ایکسرے مشین
جیسی تیز نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ کمرے میں صرف جمشید انکل کی ہی آواز گونج رہی تھی
جو جوان کی جملہ خوبیوں سے دادی کو ایسے آگاہ کر رہے تھے جیسے دادی اسے خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہوں۔
دادی ایک عمر کا تجربہ رکھتی تھیں، کچھ دیر میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ نووارد واقعی شریف و مہذب ہے اور
اچھا حسب نسب رکھتا ہے۔ کوئی اداکاری نہیں کر رہا۔ مطمئن ہو کر انہوں نے اندر کی طرف منہ کر کے شانی کو

مکمل ناول

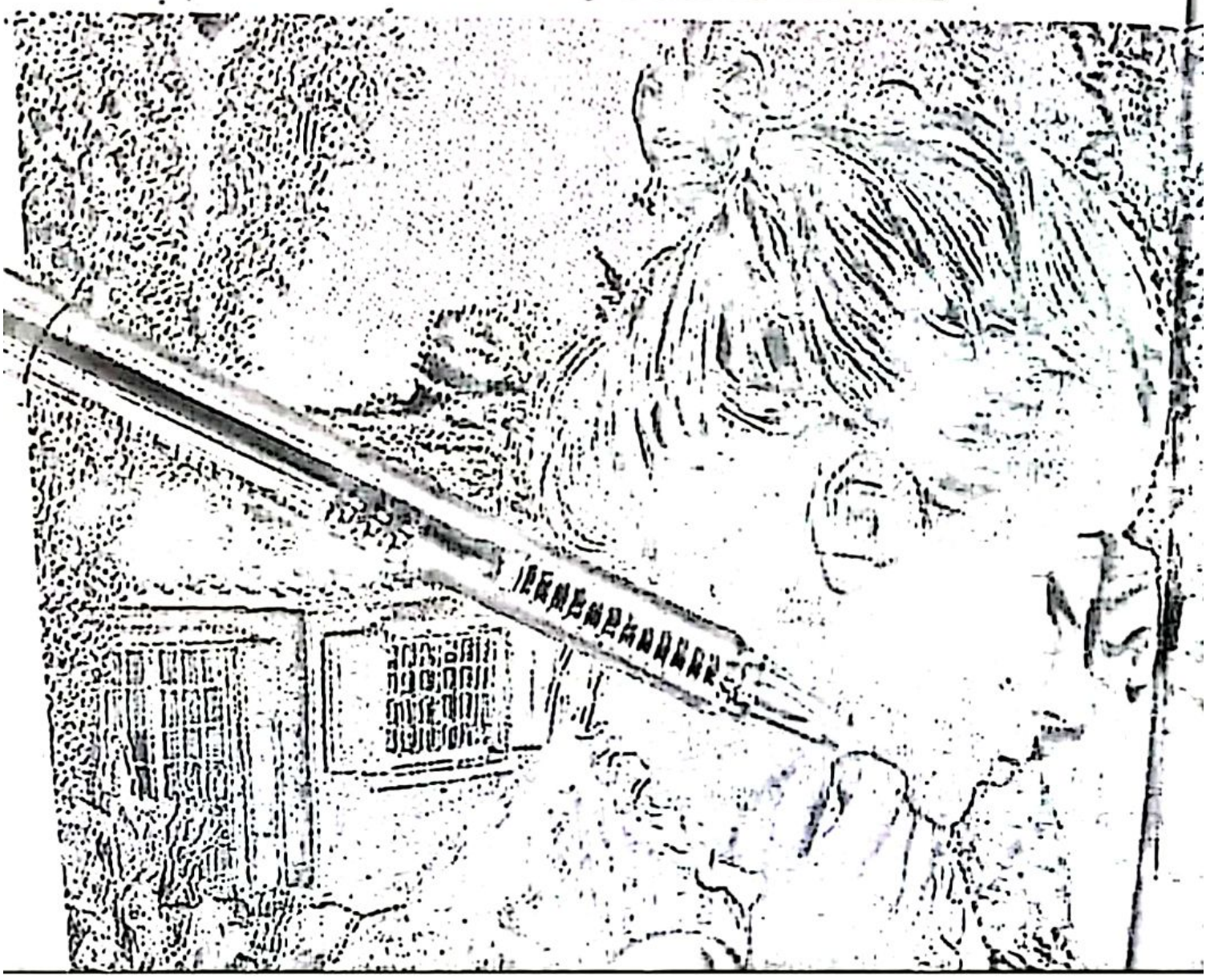

دو کپ چائے لانے کو کہا۔
"زہر نہ پلا دوں اس کمبخت کو۔" وہ کلس کر رہ گئی۔
"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" سلام کے بعد یہ دوسری بات کی تھی اس نے۔
"ٹھیک ہے جمشید کے لیے بنا لاؤ۔" دادی اس سے مخاطب ہوئیں۔ اس نے کینہ توز نگاہوں سے جمشید کی طرف دیکھا، اس وقت تو اسے وہ بھی زہر لگ رہے تھے۔
آنے والا شخص دادی کا ہونے والا کرایہ دار تھا بلکہ اب تو دادی کے جیسے تیور نظر آ رہے تھے لگ رہا تھا کہ وہ کرایہ دار ہو چکا ہے۔
یہ پرانے وقتوں کا بنا ڈبل اسٹوری مکان تھا۔ نیچے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ اوپر ایک کمرہ کچن اور واش روم بنا ہوا تھا۔ ان دادی پوتی کے لیے یہ مکان ضرورت سے زائد تھا اور پھر اوپر کا حصہ کچھ خستہ بھی ہونے لگا تھا۔ دادی میں استادم ختم نہیں تھا کہ اس کی مرمت کرائیں اس لیے کرائے پر دینے کا سوچا تھا۔
بات کچھ یوں تھی کہ یہ صاحب جمشید انکل کے محکمے میں نئے نئے افسر تعینات ہوئے تھے۔ (جمشید صاحب ان کے پڑوسی تھے، سامنے والے گھر میں رہتے تھے) گھر کے حوالے سے خاصے پریشان تھے۔ چھڑے چھانٹ تھے اس لیے کوئی انیس اپنے گھر میں رکھنے کو تیار نہ تھا۔ حالانکہ طبعاً خاصے شریف تھے مگر اندر کا حال تو خدا ہی جانے۔
جیسے ہی جمشید صاحب کو ان کی پریشانی کی نوعیت معلوم ہوئی جھٹ ان کی پریشانی اپنے سر لی اور آ پہنچے دادی کے پاس۔ دادی تو ان کا مدعا سنتے ہی ان پر چڑھ دوڑی تھیں۔ انہیں جمشید جیسے سوجھ بوجھ والے آدمی سے ایسی بات کی توقع نہ تھی، سخت ناراض ہوئیں۔ پہلا سخت ترین اعتراض انہیں یہ تھا کہ ان کا جوان جہان پوتی کا ساتھ ہے وہ کیوں کسی غیر مرد کو اپنے گھر میں گھسائیں۔ مگر دادی کے مسلسل انکار کے باوجود جمشید نے ہمت نہ ہاری۔ افسر کو اپنا دور کا رشتہ دار ثابت کرنے پر تل گئے۔ حالانکہ یہ پکا جھوٹ تھا مگر ایسا جھوٹ بولنے میں کیا حرج جو کئی لوگوں کے لیے فائدہ مند ہو۔ جانتے تھے کہ وہ طبعاً اتنے شریف ہیں کہ ان کی ذات سے دادی اور ان کی پوتی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، ایسا نہ ہوتا تو وہ ہرگز بھی اس کے لیے جہاں آرا بیگم کا گھر منتخب نہ کرتے۔ افسر صاحب جن کا نام جہان خان آفریدی تھا، ان کے زیر بار ہو جاتے اور دادی کو ایک شریف کرایہ دار کے ساتھ اچھا کرایہ بھی ملنا شروع ہو جاتا۔
"اگر اتنا ہی شریف ہے اور دور پار کا رشتہ دار بھی ہے تمہارا تو تم اس کو اپنے گھر میں کیوں نہیں ٹھہرا لیتے۔" دادی نے جیسے شان کے دل کی بات کہی تھی۔
"اماں! اگر میرے گھر میں جگہ ہوتی تو میں آپ کے پاس کیوں آتا۔" انہوں نے جواز پیش کیا۔ وہ واقعی بھرے پرے کنبے کے سربراہ تھے اور اب تو ایک بیٹے کی شادی بھی کر چکے تھے۔
دادی جمشید پر بھروسہ کرنے کے باوجود ان کی بات ماننے کو تیار نہ تھیں جب کہ وہ ہر طرح کی گارنٹی دے رہے تھے مگر انہوں نے بھی ہمت نہ ہاری، وہ مسلسل آتے رہے اور اپنی منوانے کی کوشش کرتے رہے بالآخر دادی نیم رضامند ہو گئیں، شرط یہ رکھی کہ خود کرایہ دار کو جانچوں گی اور پھر فیصلہ کروں گی۔ چنانچہ آج کرایہ دار گھر میں موجود تھا۔
شان کو اپنی آزادی خطرے میں پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے دادی سے مسلسل تین دن سے جھگڑے ہو رہے تھے۔ دادی اس پر اتنی روک ٹوک کرتی تھیں کہ کرایہ دار آ جاتا تو بالکل ہی کمرے میں قید کر دیتیں۔ وہ تن

بنا ہے جلے پیر کی بلی کی طرح بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی۔ دادی کا فیصلہ تبدیل کرانے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر دادی نے کبھی اس کی سنی بھی جواب سنتیں۔

"یہ میری پوتی ہے مشرفہ۔" وہ چائے لے کر آئی تو دادی نے تعارف کرایا۔ اس کے پیروں کو دیکھتے ہوئے اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"شانزے۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔

"ہاں شانزے۔" دادی نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی۔

"دادی پوتی دونوں خونخوار ہیں۔" اس نے سر جھکا کر مسکراہٹ ضبط کی۔ دادی گھنٹہ بھر سے میں اس کی جنم کنڈلی تک کھنگال چکی تھیں۔ کرایہ طے ہو چکا تھا۔ دادی اس کے معمولات کے بارے میں پوچھنے لگی تھیں۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆......☆

دو دن ضروری مرمت وغیرہ کے بعد وہ آج شفٹ ہو رہا تھا۔ دادی نے ایک چھوٹی الماری اور پلنگ اوپر بھجوا دیا تھا۔ شانی نے اس پر بھی بحث کی تھی۔

"لو، اب وہ بے چارا کیا فرش پر بستر ڈالے گا۔ یہاں یوں بھی تو بے کار پڑے ہیں۔" دادی نے اسے گھورا تھا۔

"ایک ایک کر کے چیزیں اوپر منتقل کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس بے چارے کو یہیں شفٹ کر لیجیے نا۔" تنک کر بولی۔ دادی پر اثر نہ ہوا۔

دادی عام طور پر اسے کہیں جانے نہیں دیتی تھیں مگر آج بڑی فراخدلی سے پڑوس میں بھیج دیا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی مغوراں نانی کے گھر چلی آئی۔

مغوراں نانی، رفو، اس کی بچپن کی سہیلی کی نانی تھیں۔ رفو دوسرے شہر میں رہتی تھی، کم کم ہی آتی تھی۔ آج کل نانی کی ناساز طبیعت کے سبب ماں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ ماں تو دو دن میں واپس چلی گئی تھی، رفو کو یہیں چھوڑ گئی تھیں ممانی پر نظر رکھنے کے لیے کہ وہ نانی کا ڈھنگ سے خیال بھی رکھ رہی ہیں یا نہیں۔ اب رفو لحہ بہ لحہ خبر ماں کو پہنچاتی تھی۔

وہ رفو کے ساتھ صحن میں چارپائی ڈالے بیٹھی تھی جب اچانک رفو کی نظر اوپر اٹھی، وہ دیوار کے پاس کھڑا مزدوروں سے سامان ترتیب سے رکھوا رہا تھا۔ چار فٹ کی دیوار کے پار سے اس کا سائیڈ پوز نظر آ رہا تھا۔

"ہائے اللہ شانی! یہ تیرے گھر میں کون آیا ہے۔" رفو سب جانتی تھی مگر دوسروں سے اگلوائے بنا اسے چین آتا تھا۔

"دادی نے اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا ہے۔" اس نے مرے مرے لہجے میں اطلاع دی۔

"ہائے شانی یہ کتنا خوبصورت ہے۔" رفو متاثر ہو گئی تھی۔

"دفع دور۔" اس نے کلس کر رفو کے دھموکا جڑا۔

"کوئی نہیں، اپنے سرخ و سفید نازک نظر آنے والے مرد، مرد تو کہیں سے نہیں لگتے کچھ اور ہی لگتے ہیں۔" وہ پہلے ہی جلی بیٹھی تو تھی۔ رفو کے تبصرے اور تعریفیں جلتی پر تیل کا کام کر گئے تھے۔

"ہیں......" اس کی بات سمجھ کر رفو نے اسے کچھ حیرت و صدمے سے دیکھا پھر ہنس پڑی۔

CS CamScanner

''تو بالکل پاگل ہے شانی، ایسے ہیرو ٹائپ بندے کو دیکھ کر تو نے سوچا بھی تو کیا؟''

''ہاں ویسے تجھے کہاں ہیرو ویرو کی سمجھ آئے گی۔'' تو ناول تک تو پڑھتی نہیں اور تیرے پچاس سال پرانے ٹی وی میں بھی کچھ نہیں آتا۔'' وہ طنز سے بولی۔ شانی نکر نکرا سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی عزیز سہیلی یکدم بری لگنے لگی۔

''ہائے، اماں نے میری منگنی کرنے میں کچھ زیادہ جلدی کر دی۔'' اس کی آہیں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے تایا زاد سے منسوب تھی اور کل تک اپنا منگیتر اسے دنیا کا سب سے پیارا شخص لگا کرتا تھا۔ شانی اس کے پاس سے اٹھ کر صغوراں نانی کے پاس چلی گئی۔

دادی سحر خیز تھیں۔ صبح اٹھتے کے ساتھ ہی ان کا محبوب مشغلہ شانی کو اٹھانا تھا اور اسے تب تک انجام دیتی رہتیں، جب تک وہ بستر نہ چھوڑ دیتی۔ اسے نماز پڑھوا کر ہی وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوتیں۔ اسے کالج چھوڑنے جاتیں۔ وہ فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ واپسی پر ایک مصروف ترین دن ان کا منتظر ہوتا۔ محلے کی بچیاں سپارہ پڑھنے آجاتیں۔ ذرا دن چڑھتا تو لڑکیاں بھی سلائی کڑھائی اور دیگر امور خانہ داری سیکھنے آنا شروع ہو جاتیں۔ اس کام کا وہ کوئی معاوضہ نہ لیتی تھیں۔ جس کا جو دل چاہتا اپنی مرضی سے ان کے لیے لے آتا۔ یوں ان کا گھر انواع و اقسام کی سوغاتوں سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا۔ اور وہ کبھی منع بھی نہیں کرتی تھیں کہ یہ سب ان کی ضرورت تھا۔ دوسرے شہر میں رہنے والے ان کے بیٹے پانچ چھ مہینوں بعد انہیں چند ہزار بھیجنے کے بعد اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جایا کرتے تھے۔ محلے کے لوگوں کے لیے وہ بے حد قابل احترام تھیں۔ وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ محلے کی تقریباً ہر عمر کی عورت ان کے پاس اپنے مسئلے مسائل لیے چلی آتی تھی۔ اپنی بیٹیوں کو تربیت کے لیے ان کی آغوش میں دے کر وہ مطمئن ہو جاتیں۔ شام کو محلے کے سارے بچے شانی کے پاس ٹیوشن پڑھنے آجاتے جو معمولی فیس وہ ان بچوں کو پڑھانے کی وصول کرتی تھی، اس سے اس کے اپنے اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ چھوٹا سا شہر تھا، لوگوں کی خواہشات محدود تھیں۔ دکھ سکھ سانجھے تھے۔ یوں تو ان کے گھر صبح سے رونق لگی رہتی تھی۔ مگر آج تو لگتا تھا کہ سارا محلہ ان کے گھر امڈ آیا ہے۔ وجہ وہی تھی کرایہ دار، سب کے چہرے پر حیرت درج تھی۔ انہوں نے دبے لفظوں میں استفسار کیا تو دادی مسکرا دیں۔

''جمشید بضد تھا کہ میں اس کو کرایہ دار رکھوں، میں تو راضی نہ تھی مگر جمشید نے گارنٹی لی۔ اب جمشید جس شخص کی گارنٹی لے وہ کوئی برا آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ تمہیں جمشید کی سمجھ پر شک ہو مگر میری فہم پر تو نہ ہوگا۔ نیک شریف ماں باپ کی اولاد ہے۔ یہی گن اس میں بھی ہے۔ دو دن تو لڑکے کو آئے ہوئے ہو گئے ہیں، اتنا تو تم لوگوں نے بھی دیکھ لیا ہوگا اور پھر میں کوئی اکیلی تو ہوں نہیں، تم لوگ ہو میرے ساتھ اور پھر اکیلے لڑکے سے ہمیں یا تمہیں کیا ڈر ہو سکتا ہے۔ موا صبح کا گیا شام ڈھلے آیا کرے گا صرف سونے۔ شانی کی حفاظت کی غرض سے گرل لگوا دی ہے ہم نے، اوپر کا راستہ بھی علیحدہ ہو گیا ہے۔'' انہوں نے بات ختم کر کے سب کو دیکھا۔

ان سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ شانی کی حفاظت کتنی اچھی طرح سے کر سکتی ہیں۔ یہ تو سب جانتے تھے۔ کچھ زیادہ پرانا قصہ نہیں تھا۔ یاد آتے ہی عورتوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گیا۔ شانی کو بھی وہ شام پوری جزیات سمیت یاد آ گئی تھی اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے محبت اور کچھ فخر سے دادی کو دیکھا اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک شام شانی حسب معمول ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتی، چھت پر ٹہل رہی تھی۔ دادی نیچے سے آوازیں لگا رہی تھیں اور وہ ہمیشہ کی طرح کان نہ دھرتے ہوئے آواز لگاتی ''بس ابھی آئی۔'' کچھ

دیر کے لیے خاموشی چھا جاتی اور وہ پھر سے اسے آوازیں دینے لگتیں۔
منڈیر تک آ کر وہ واپس پلٹی ہی تھی کہ ایک پتھر اڑتا ہوا آ کر زور سے اس کی کمر سے ٹکرایا۔ بھنا کر پتھر اٹھا کر اس نے گلی میں جھانکا تو سامنے رہنے والے اسلم عرف صلو صاحب کو دانت نکوستے ہوئے اپنی طرف متوجہ پایا۔ صاحب خود کو سلمان خان سمجھتے تھے۔ زلفیں چہرے کے گرد بکھرائے رادھے بنے پھرتے۔ محلے کی بہو بیٹیوں کو تاڑنا ان کا محبوب مشغلہ تھا تو ہرا کیلی لڑکی کا باڈی گارڈ بن کر پیچھے لگ جانا اور اسے اس کی منزل تک چھوڑنا ان کا فرض تھا۔ محلے والے ان سے نالاں تھے۔ بدن پر ہر سائز کی چپل کا نشان تھا مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تھے۔
قریب تھا کہ شانی وہی پتھر تاک کے اس کے سر پر دے مارتی کہ اس میں ربر سے بندھے رقعہ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ رقعہ اس میں سے نکال کر اس نے پتھر اسے کھینچ مارا جو اس کے کاندھے سے ٹکرایا۔ بڑے اسٹائل سے کندھا سہلاتے ہوئے اس نے چہرے پر لوفرانہ مسکراہٹ سجا کر اوپر دیکھا۔ وہ غائب ہو چکی تھی۔

وہ خط لیے نیچے چلی آئی اور اس بیہودہ خط کو دادی کے سامنے لہک لہک کر پڑھا۔ دادی تپ کر سرخ ہو گئیں۔ خط اس کے ہاتھ سے جھپٹا اور باہر نکل گئیں۔
سامنے اپنے گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھا صلو دیدہ و دل فرش راہ کیے ان کی چھت پر نظر گاڑے بیٹھا تھا۔ انہیں آتے دیکھا تو گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ بھاگنے کے لیے پر تولتا دادی اسے کان سے کھینچتی ہوئی اس کے گھر کے اندر لے گئیں۔ اور جو چپل اتار کر اس کی مرمت شروع کی تو بس۔ پورا محلہ مع شانی اس براہ راست ڈرامے کو اپنی چھتوں پر سے ملاحظہ کر رہا تھا۔
''ارے اماں! کچھ بتاؤ تو کہ ہوا کیا ہے کیوں میرے بچے کو یوں پیٹ رہی ہو؟'' اس کی اماں نے اپنے بچے کی درگت بنتے دیکھی تو اسے بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔
دادی نے رقعہ اس کی بہن کی طرف اچھالا اور پڑھنے کا کہہ کر ایک طرف کھڑی ہو کر ہانپنے لگیں۔ بہن نے بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا تو دادی کا کام محلے کی ان لڑکیوں اور عورتوں نے سنبھال لیا جو آوازیں سن کر صلو صاحب کے گھر میں جمع ہو گئی تھیں۔
پہلے ایک جوتی برس رہی تھی اب کئی برسنے لگیں۔ خط اتنا بیہودہ تھا کہ بہن بیچاری بھی آدھا پڑھ کر چپ ہو گئی۔
''ارے تو اپنی لاڈلی پوتی کو بھی تو سمجھاؤ، سارا دن چھت پر ٹہلتی رہتی ہے۔'' صلو کی اماں چمک کر بولیں۔
''اپنی چھت پر ٹہلتی ہے کوئی تمہارے گھر آ کر تو نہیں ٹہلتی۔'' دادی کو مزید جلال آ گیا۔ ایک چپل اسے بھی کھینچ ماری۔
جمشید ابھی آفس سے لوٹے تھے۔ صلو کے گھر کے باہر بھیڑ دیکھ کر راستہ بناتے اندر چلے آئے۔ دادی سے ماجرا دریافت کیا اور پھر خود بھی اس کارِ خیر میں حصہ ڈالا، غرض سب نے خوب دل کی بھڑاس نکالی اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔
''منحوس، نگوڑے، ناس پیٹے! تجھے بھی عشق لڑانے کو وہی ملی تھی۔'' محلے والوں کے جاتے ہی اماں شروع ہو گئیں۔
''مجھے کیا پتا تھا اماں کہ میرا پہلا خط ہی دادی کو دے دے گی۔'' وہ کراہتا ہوا بولا تھا۔

اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے جسم پر نقش و نگار بن گئے تھے۔ اس کے کئی دن چارپائی پر پڑے ہائے ہائے کرتے گزرے تھے۔

☆.....☆

"شعیب.....او شعیب! یہ چائے کا کپ اوپر انکل کو دے آؤ۔" کن انکھیوں سے دادی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پڑھنے والے بچے کو ٹہوکے لگائے۔ دادی تسبیح پڑھتے ہوئے چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"آج سارا دن اوپر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آتی رہیں۔ بیچارا سامان سیٹ کرتے کرتے تھک گیا ہوگا۔" چہرے پر معصومیت سجا کر اس نے دادی کو وضاحت دی۔ وہ مطمئن ہو کر پھر سے تسبیح میں مشغول ہو گئیں۔

"دھیان سے لے کر جاؤ گرا مت دینا۔ کہنا دادی نے بھیجی ہے۔" اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"انکل! دادی نے چائے بھیجی ہے۔" بھاپ اڑاتے کپ کو بہ مشکل سنبھالتا وہ اوپر پہنچ گیا تھا۔ الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ خود بھی ابھی چائے بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بے حد تھکاوٹ ہو رہی تھی۔ گرما گرم چائے کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بچے سے ٹرے لے کر پلنگ پر رکھی۔ جواب کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"پہلے ہم یہاں ٹیوشن پڑھتے تھے۔" بچے نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

"اچھا....." اس نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"شعیب۔" مختصر جواب آیا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"ساتویں میں۔" جواب دیتے ہی اسے یاد آیا کہ ابھی اس کا بہت سا ہوم ورک باقی ہے، اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"کہاں رہتے ہو؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"دو گھر چھوڑ کر میرا گھر ہے۔ اب میں چلتا ہوں، دیر کی تو آپی پٹائی لگا دیں گی۔" وہ مڑ کر اس سے بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے جاؤ تمہاری آپی تو ویسے بھی بڑی خونخوار ہے۔" آخری جملہ اس نے زیر لب کہا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"آخ تھو۔" پہلا گھونٹ بھرتے ہی اس نے بے اختیار تھوکا تھا۔

"اتنی دیر کیوں لگائی۔" وہ ٹہلتے ہوئے اس کی منتظر تھی۔

"انکل بڑے باتونی ہیں، باتوں میں لگا لیا تھا۔" اس نے زمانے بھر کی مسکینیت چہرے پر طاری کی۔

اپنے کام سے فراغت کے بعد وہ برتن لیے نیچے چلا آیا۔ گیٹ نیم وا تھا۔ سامنے ہی وہ دس بارہ بچوں کے ساتھ آنکھوں پر پٹی باندھے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کچھ جھجک کر اس نے گیٹ بجایا اور تھوڑا اندر چلا آیا۔

"یہ برتن لے لیں۔" اس کی آواز پر اس نے سرعت سے پٹی اتاری اور شعیب کو اشارہ کیا۔ وہ جانے کو مڑا پھر پلٹ کر دادی سے مخاطب ہوا۔

"دادی! آپ نے چائے میں چینی کے بجائے نمک، دال دیا تھا۔" تسبیح پڑھتی دادی نے چونک کر اسے اور رشانی کو دیکھا تھا۔

"کمبخت، میں بھی کہوں کل تک اس کی آمد پر رولا ڈالا جا رہا تھا تو آج میزبانی کا مروڑ کیوں اٹھنے لگا۔" اس کے جاتے ہی دادی نے اس پر چپل فائر کی مگر وہ صاف بچ گئی۔ بچے کھی کھی کرنے لگے تھے۔

جھوٹا مکار...... جھوٹ بول کر گیا ہے۔" میں نے چینی ہی ڈالی تھی وہ تلملا گئی۔

"سدھر جا شانی! سدھر جا...... کل کو اگلا گھر بھی دیکھنا ہے۔" دادی ہمیشہ کی طرح اسے سدھرنے کی نصیحت کرنے لگیں مگر اسے کان نہ دھرتے دیکھ کر غصہ میں آ گئیں۔ فوراً بچوں کو گھر جانے کا حکم صادر کیا۔ پیچھے وہ کلستی رہ گئی۔

☆......☆

ابھی وہ ناشتہ کرنے بیٹھی ہی تھی کہ وہ اوپر سے دھم دھم کرتا سیڑھیاں اترا تھا۔

"خدا حافظ دادی۔" اس نے گرل سے منہ لگا کر ہانک لگائی۔ وہ جاتے ہوئے خدا حافظ اور آتے وقت سلام کرنا نہ بھولتا تھا۔ ہفتہ بھر ہو گیا تھا اسے آئے ہوئے۔

"خدا حافظ، خیر سے جاؤ خیر سے آؤ۔" دادی کو اس کی عادت ہو گئی تھی۔

تجھے تو بکو میں بھگا کر دم لوں گی، حسب معمول جل کر سوچتے ہوئے وہ نوالے نگل رہی تھی۔

"مشرفہ بچے! جلدی کر، دیر ہو رہی ہے۔" دادی نے آواز لگائی۔

"شانزے دادی۔" وہ چونک کر حال میں لوٹتے ہوئے جھلائی۔ دادی دو ہی صورتوں میں اس کا پورا نام لیتی تھیں یا تو اس پر پیار آتا جب یا پھر شدید غصے میں ویسے عموماً شانی کہتی تھیں۔

"ہاں ری۔" دادی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

وہ مشرفہ سے شانزے کیسے ہو گئی تھی؟ بچپن میں تو اس کا نام مشرفہ رکھا گیا تھا جو اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ مگر جب سے لوگوں نے مشرف کو گالیاں دینا شروع کی تھیں اسے اپنا نام اور بھی کھٹکنے لگا تھا۔

کالج کی اکثر لڑکیاں اسے مشرف کہہ کر چھیڑتی تھیں مگر جب ایک دن اس کی سہیلی نے بھی اسے مشرف کہا تو اس نے بھاں بھاں کر کے رونا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری پریشان ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا اور وجہ پوچھی۔ جواباً اس نے جو وجہ بتائی تو حیران رہ گئی۔

"تم اپنا نام بدل ڈالو۔" اس نے کہا۔ آئیڈیا تو اسے پسند آیا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ نئے نام کی عادت ڈالنا ذرا مشکل تھا۔

"کچھ مشکل نہیں ویسے بھی زیادہ تر لوگ تمہیں شانی کہتے ہیں جو چند ایک نام لیتے ہیں وہ بھی چند بار ٹوکنے پر نیا نام لینا شروع کر دیں گے۔" دوسری نے کہا۔ اس کے رونے پر اس کی دیگر سہیلیاں بھی وہاں آ گئی تھیں۔

"مگر نام ایسا ہونا چاہیے جو تمہارے نک کے ساتھ بھی میچ کرے۔" ایک نے نکتہ اٹھایا اور سب سوچ میں ڈوب گئیں۔

"کیا نام ہونا چاہیے......؟ شا...... ن...... شانزے۔" ایک سوچ کے سمندر میں غوطے لگاتے بہرحال ایک نام برآمد کر لائی تھی اور اسے بھی یہ نام پسند آیا۔

"تو پھر آج سے تمہارا نام شانزے۔" سب کی اتفاق رائے سے اس کا نام شانزے تجویز ہوا۔ اس کی ایک دوست نے فٹافٹ ایک معروف اخبار کے لیے تبدیلی نام کا اشتہار بھی لکھ ڈالا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ نام اس نے بدلا ہے تو اشتہار کیوں دے مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ اشتہار کتنا ضروری

تھا۔ اشتہار دکھا کر اس نے کالج کے ڈاکومنٹس میں نام تبدیل کرایا تھا۔

"دادی! میں نے اپنا نام مشرفہ سے بدل کر شانزے رکھ لیا ہے اس لیے آج سے مجھے شانزے لکھا اور پکارا جائے۔" گھر آتے ہی اس نے اخبار لہرا کر اعلان کیا۔ پہلے تو دادی کو کچھ سمجھ نہ آیا اور جب آیا تو اس کے خوب لتے لیے کیونکہ اس کا نام مشرفہ دادی نے ہی رکھا تھا۔

☆.....☆

سردیوں کی آمد آمد تھی اور وہ دادی کے سر ہو گئی کہ شلجم کا اچار ڈالو۔

"ڈال لوں گی شانی! ذرا صبر تو کر سردیاں تو آنے دے۔" دادی بولیں۔

"آ تو گئیں ہیں بس اب ڈال بھی لیں۔"

اس کی روز روز کی ضد سے تنگ آ کر دادی نے اچار ڈال ہی دیا۔

"خبردار شانی! جو تو نے تین چار دن سے پہلے اسے ہاتھ بھی لگایا ہو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

چھت پر رکھے مرتبان کے منہ پر کپڑا باندھتے ہوئے دادی نے دھمکایا کیا اور اس نے بڑی فرمانبرداری سے گردن ہلا دی۔

تین دن اس نے بڑے صبر سے گذارے تھے۔ "اب تک تو اچار کھٹا ہو گیا ہوگا۔" سوچتے ہوئے اس نے برابر میں سوئی دادی کو دیکھا اور احتیاط سے پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دبے قدموں وہ اوپر چھت پر چلی آئی تھی۔ پیالی میں اچار نکال کر وہ وہیں چھت کی آخری سیڑھی پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ شلجم کچے تھے، کھٹاس کم تھی مگر اس کے بے قرار دل کو قرار آنے لگا تھا۔

کمرے سے باہر آتا، وہ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ پیچھے سے بولا۔

اس اچانک افتاد پر اسے اچھو لگ گیا۔ پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس کے سامنے کھڑی کھانس کھانس کے بے حال ہوتی، وہ اسے غصے سے گھورنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سٹ پٹا گیا۔ بھاگ کر پانی کی بوتل لے کر آیا اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر لبوں سے لگائی۔ پانی پی کر سانس بحال ہوا تو بوتل اسے پکڑا کر وہ خشمگیں نظروں سے گھورنے لگی۔

"آپ ٹھیک ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"تم نے تو مارنے کا پورا انتظام کر دیا تھا، تمہیں تمیز ہے یا نہیں، لے کر پیچھے سے ڈرا دیا۔"

آنکھوں سے پانی صاف کرتے ہوئے وہ شدید غصے سے بولی۔

"میری موجودگی میں آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" محتاط نظروں سے اردگرد کی چھتوں کا جائزہ لیتا، وہ اس کے لہجے پر جز بز ہوا تھا۔

"مجھے کیا الہام ہوا تھا کہ تم اوپر بیٹھے ہو۔ چوروں کی طرح آنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔" تیوری پر بل ڈالے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے آج جلدی آ گیا۔ دادی نے دیکھا تھا مجھے آتے ہوئے۔" اس کے انداز پر اسے بھی اب غصہ آنے لگا تھا۔ ذرا تمیز چھو کر نہیں گذری اس لڑکی کو۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس کے پوچھنے پر اسے حیرت ہوئی۔

"فلو۔" مختصر جواب دیا۔ وہ چند پل اسے دیکھتی رہی۔ وہ رومال منہ پر رکھے کر دو تین بار چھینکا بھی تھا۔ اس نے جھک کر مرتبان کے قریب الٹی ہوئی پیالی اٹھائی اور اس کے برابر سے گزر کر کچن کی طرف بڑھی۔

"آپ کو نیچے چلے جانا چاہئے۔" اسے کچن کی سمت جاتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

"جا رہی ہوں، یہاں بسیرا کرنے نہیں آئی۔" مڑ کر اسے جواب دیا۔ پیالی دھو کر اچار نکال کر اس نے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ پی لو، تمہارا فلو ٹھیک ہو جائے گا۔" اب کے لہجہ نرم تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے مشروب نما چیز دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"شلجم کا پانی والا اچار۔" اس نے کچھ تاسف سے اسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو اتنا نہیں معلوم۔ کچھ تذبذب سے اس نے پیالی تھامی۔

"پی لینا۔" وہ اسے تاکید کرتی ہوئی نیچے چلدی۔ اور وہ دکھتے سر، بہتی ناک اور بخار کی حرارت سے کچھ ایسا گھبرایا ہوا تھا کہ چند ثانیے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے چارپائی بچھائی اور اس پر لیٹ گیا۔ ہلکی ہلکی دھوپ سکون بخش رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

کوئی چیز زور سے اس کے سینے پر لگی تھی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چارپائی کے پاس گیند پڑی تھی۔ نیچے سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ بھنا گیا۔ گیند اٹھا کر نیچے جھانکا۔ نیچے وہ بیٹ تھامے اوپر دیکھ رہی تھی۔ آج دادی گھر پر نہیں تھیں سو اسے اور بچوں کو پوری آزادی تھی محلہ سر پر اٹھانے کی۔

"بال دو۔" نیچے سے حکم صادر کیا گیا۔ اس نے ایک نظر اسے اور پھر ہاتھ میں پکڑی بال کو دیکھا اور بال اسے کھینچ ماری۔ پھرتیلی تو وہ تھی، فوراً نشانے سے ہٹ گئی۔ غصے سے اوپر دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

وہ اندر جا کر پلنگ پر گر گیا۔ "خدا سمجھے اس لڑکی کو تو۔" وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔ گلا اندر سے چھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا، درد بھی شدید تھا۔ طبیعت مزید خراب ہو گئی تھی۔

"میں نے بھی بیوقوفوں کی طرح اچار غٹا غٹ پڑھا لیا۔" اسے خود پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ "یہ لڑکی نہیں آفت کی پڑیا ہے۔" وہ سوچ رہا تھا۔

☆.....☆

بڑے تایا تائی کی اچانک آمد نے اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ تو اب عید پر بھی پابندی سے نہ آتے تھے۔ دادی سے استفسار کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور اسے پکانے پر لگا دیا مگر کچھ ہی دیر میں دادی پر عقدہ کھل گیا۔ بڑی بہو ان سے بڑے پیار سے شانی کا ہاتھ اپنے بڑے بیٹے اظفر کے لیے مانگ رہی تھیں۔ دادی بوکھلا گئیں مگر خاموش رہیں۔ کوئی جواب نہ دیا۔

"اماں بتائیں ناں پھر آپ کا کیا جواب ہے۔" بڑی بہو کے لہجے میں اصرار تھا۔

"ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے ارادے سے آئی ہو کیا؟ بی بی سوچ بچار تو کرنے دو۔" دادی کے لہجے میں ناگواری در آئی۔

"اماں! اس میں سوچنا کیسا، اظفر بھی تو آپ کا پوتا ہے۔" کچھ پریشان ہو کر انہوں نے جتایا۔

"بالکل اماں، آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ اظفر آپ کا پوتا ہے پر شانی کی آپ پرورش کی ہے۔" ان کے بیٹے نے کہا تو بہو نے خشمگیں نظروں سے انہیں دیکھا۔

اظفر ان کا پوتا تھا اور اس حوالے سے انہیں عزیز بھی تھا مگر بڑی بہو کے مزاج سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں اس کی زبان دو دھاری تلوار تھی۔ شادی کے دوسرے سال ہی لڑ جھگڑ کر الگ ہو گئی پھر دوسرے شہر جا بسی۔ زبان کے بل پر ہی میاں کو قابو کیا ہوا تھا۔ اولاد نجانے کس پر پڑی تھی۔ خود ان کو حیدر آباد گئے کافی عرصہ ہو گیا تھا اور وہ لوگ بھی خیر پور کم کم ہی آتے تھے۔ کوئی بات تھی جو انہیں بے حد کھٹک رہی تھی۔

سوچتے سوچتے بہت دیر میں ان کی آنکھ لگی تھی مگر جلد ہی کھل گئی۔ بڑی بہو جانے سے پہلے شانی کو انگوٹھی پہنا کے جانا چاہتی تھیں، وہ پھر سوچنے لگیں ان سب باتوں سے بے خبر شانی ان سے لپٹ کر سو رہی تھی۔ تہجد کا وقت تھا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کی بانہیں اپنے گلے سے نکالیں اور کھڑی ہو گئیں۔

"اماں اگر راضی ہو گئیں تو میں دو تین مہینے میں شانی کو بیاہ کر لے جاؤں گی۔" وہ وضو کر کے آ رہی تھیں جب ساتھ والے کمرے سے مدہم سی آواز سنائی دی۔

"لو، یہ تو بالکل ہی اتاؤلی ہو رہی ہے۔" انہوں نے سوچتے ہوئے قدم بڑھائے مگر پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔

"کیا خیال ہے، یہ مکان بیچ کر اتنی رقم حاصل ہو جائے گی جتنی اظفر کو اپنے بزنس کے لیے درکار ہے۔" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"اتنی رات کو مکان کی قیمت کے اندازے لگانے چھوڑ دو، خود بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ تم دونوں ماں بیٹے کا لالچ تمہیں کسی دن بہت ذلیل و خوار کرائے گا۔" انہیں اپنے بیٹے کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ شکر ادا کرتیں کمرے میں چلی آئیں۔ جو بات انہیں کھٹک رہی تھی وہ سامنے آ گئی تھی۔

دادی نے صبح ہوتے ہی انکار کر دیا تھا۔ شانی جواب تک انجان تھی حیرت سے منہ کھولے سب کو تک رہی تھی۔ دادی کے اشارے پر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ دونوں میاں بیوی حیران تھے انہیں انکار کی ایک فیصد بھی امید نہ تھی۔

"انکار کی کوئی وجہ تو بتائیں۔" بہو تلملا اٹھیں۔

"بس کچھ وجہ نہیں۔" ایک تیز نظر ان پر ڈالتے ہوئے انہوں نے ٹالا۔

"نہیں، وجہ تو آپ کو بتانا پڑے گی۔ آپ کو پتا ہے میرے اظفر کے لیے اتنے اونچے اونچے گھرانوں کے رشتے آئے ہوئے ہیں مگر میں یہاں آئی آپ کے پاس مرحوم دیور کی نشانی سمجھ کر، یتیم سمجھ کر۔" انہوں نے نفسیاتی حربہ اختیار کیا۔ دادی نے اگر ان کی کل رات کی بات نہ سن لی ہوتی تو یقیناً ان کا احسان مانتے ہوئے انہیں ہاں کر دیتیں۔

"خدا کا واسطہ لی بی، ہمیں معاف رکھو جن اونچے گھرانوں سے تمہارے بچے کے رشتے آئے تم وہاں رشتہ کر دو، ہمیں معاف رکھو۔" دادی نے جل کر ہاتھ جوڑے۔

"مگر اماں۔" بیٹے نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم تو رہنے دو میاں، تمہاری بیوی کی زبان کے آگے تمہاری ایک نہیں چلتی ہم نہیں چاہتے کہ ہماری بچی کا بھی یہ حال ہو۔" دادی نے بات کاٹ دی وہ خاموش ہو گئے۔ "اب اٹھ جائیں کب تک یہاں بیٹھ کر بیوی کی بے عزتی کراتے رہیں گے۔" وہ چلائیں۔ وہ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔

دادی کچن میں چلی گئیں تو شانی باہر نکل آئی تایا بیگ لینے کمرے میں گئے تو وہ تائی سے مخاطب ہوئی۔

"اچھا ہوا تائی امی دادی نے منع کر دیا، مجھے بھی اتنا موٹا چشمہ لگانے والے لمبے بانس جیسے اظفر بھائی بالکل پسند نہیں۔" انہیں آگ لگ گئی۔

''ارے احسان مانو تم دادی پوتی میرا کہ میں یہاں آئی جیسے تم دادی پوتی کے نخرے ہیں کوئی اس گھر کی دہلیز نہیں چڑھے گا۔'' وہ چیختی چلاتی چلی گئیں۔

''کیا ضرورت تھی تجھے یہ کہنے کی۔'' ان کے جانے کے بعد دادی نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

''وہ مجھے میری دادی سے الگ کرنے آئی تھیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال

☆.....☆

اسے آئے دو ماہ سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا مگر شانی کا اسے بھگانے کا جنون سر نہ پڑا تھا۔ روز وہ نئے پلان بناتی اور مسترد کر دیتی۔ سہیلیوں نے جو اسے اتنا پریشان دیکھا تو وجہ پوچھی اور وہ تو تیار بیٹھی تھی۔ الف سے ی تک ساری رام کہانی سنا دی۔

''یار دو میرے غم کی دوا کرو۔'' شانی کے چہرے پر درج تھا۔ وہ سب کی سب سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ آخر ایک پٹاری سے ایک نسخہ برآمد کر لائی۔ شانی نے جو سنا تو جھٹ نفی میں گردن ہلا ڈالی۔

''تم اس پر عمل کرو شانی! یہ بڑا مجرب نسخہ ہے ضرور اثر کرے گا۔'' اسے تسلی دی گئی۔

''نہیں بھئی مجھ سے نہیں ہو گا یہ اگر الٹا اثر ہو گیا تو۔'' اس نے امکان ظاہر کیا۔

''کوئی الٹا اثر نہ ہو گا جس طبیعت کا تم نے وہ آدمی بتایا ہے جلد اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ جائے گا۔''

اگر دادی کو پتا چل گیا تو.....'' اس پر دادی کا خوف طاری ہوا۔

''ایسا کوئی امکان نظر تو نہیں آتا لیکن اگر ایسا ہوا تو ہم تجھے ایک خط لکھ دیں گے جا کر دادی کو دینا باقی وہ دادی خود اس سے نبٹ لیں گی۔'' دادی کی صلو سے نپٹنے کی کہانی ان سب کو معلوم تھی۔ غرض اس کے سارے اعتراضات رد کر کے پیٹھ ٹھونک کے اسے آج ہی میدان میں کودنے کا مشورہ دیا گیا اور شانی نے بیتوفیوں کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے ہامی بھر لی۔

کام میں مصروف میسج کی رنگ ٹون پر اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور میسج کھولا، اگلے ہی پل اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، اس نے دوبارہ میسج پڑھا تھا۔

تجھ کو سوچوں تو ایسے لگتا ہے
جیسے خوشبو سے رنگ ملتا ہے
جیسے بارش میں پھول کھلتا ہے

نمبر مکان مالک کے نام سے سیو تھا اب یہ ایس ایم ایس دادی تو کر نہیں سکتی تھیں۔ ''تو کیا.....مگر کیوں.....؟'' وہ الجھنے لگا تھا۔ ''شاید کسی نمبر پر سینڈ کیا ہو اور غلطی سے یہاں بھیج دیا۔

اس نے تخت پر بیٹھی دادی کو سلام کیا تھا۔ سر خم کر کے انہوں نے جواب دیا اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ دادی کے قریب بیٹھی شانی کو دیکھ کر دوپہر میں آیا میسج اس کے دماغ میں روشن ہوا تھا۔ اس نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھنا چاہا مگر وہ اٹھ کر اندر چل دی۔ وہ تخت کے قریب موڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا۔ دادی نے تسبیح پوری کر کے اس پر پھونک ماری۔ وہ مسکرا دیا۔

''آج تو خاصی ٹھنڈ ہے، آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟'' شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ ٹھنڈ بھی بڑھ گئی تھی۔

''سردی ہو یا گرمی عصر کی نماز یہیں پڑھنے کی عادت ہے تم تو موٹر سائیکل پر اڑتے ہوئے آئے ہو، یوں تمہیں سردی زیادہ لگ رہی ہو گی شانی سے کہے دیتی ہوں چائے بنانے کا۔'' اس سے پہلے وہ جواب دیتا وہ

اسے آواز دے چکی تھیں۔
"بنالی ہے دادی۔" وہ چائے لیے حاضر ہوئی اور اس کے سامنے رکھ کر پلٹ گئی۔ میسج ٹون پر اس نے جیب سے موبائل نکالا۔
"اچھے لگ رہے ہیں۔" بے اختیار ہی اس کی نگاہ اٹھی، وہ سرعت سے کمرے میں گم ہو گئی تھی۔ اس کا گلابی آنچل ہی لہراتا نظر آیا تھا۔ اس میسج کے بعد اس کی غلط فہمی تو دور ہو گئی تھی جیسے اس نے چائے کا کپ ختم کیا تھا۔
"آپ کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔" اور پرا گر کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد اس نے ٹائپ کیا تھا۔
"میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ ایک تعریف ہی تو کی ہے۔" فوراً ہی ڈھٹائی بھرا جواب آیا تھا۔
پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ دن میں ڈھیروں ڈھیر میسج کرتی تھی۔ کچھ دن تو اس نے نظر انداز کیا پھر اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ انتہائی ڈھیٹ تھی۔ وہ بری طرح زچ ہونے لگا۔ تنگ آ کر اس نے دادی کو بتانے کی دھمکی دی تھی۔
"بتا دو۔" خاصے اطمینان سے جواب آیا تھا۔
وہ پریشان ہونے لگا۔ بڑی مشکل سے اسے یہ ٹھکانہ ملا تھا۔ اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے تو کسی بھی جگہ ٹرانسفر کی صورت میں اسے گھر اور گاڑی کی سہولت ملتی تھی۔ مگر جو گھر اسے الاٹ کیا گیا تھا۔ اس پر کسی اور آفیسر کا قبضہ تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ گھر سے قبضہ ختم کرانے کی یا اسے کوئی اور گھر مل جائے مگر معاملہ طول پکڑنے لگا تھا۔ سرکاری کام ایسے ہی ہوتے ہیں مگر اب پھر اس نے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔
جلد تھکاوٹ کے سبب آج وہ جلد ہی سو گیا تھا۔ مسلسل بجتی موبائل کی رنگ ٹون کے سبب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ فون اٹھا کر دیکھا تو شدید غصہ آ گیا۔ پہلے میسجز کر کر کے تنگ کر رہی تھی۔ اب کال کر رہی تھی اس نے کال منقطع کر دی مگر لمحے کی تاخیر کے بغیر دوبارہ کال آنے لگی تھی۔ اسے خیال گذرا کوئی پرابلم نہ ہو اس لیے اب کال ریسیو کر لی۔
"ہیلو.....!!" اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔
"آپ سو رہے تھے؟" معصومیت سے استفسار کیا گیا۔ وہ جل گیا۔
"کام کی بات کیجیے۔" دانت پیس کر بولا۔
"دراصل کل میرا ایک امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے۔ مجھے ایک شعر کی تشریح کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ دادی نے کہا آپ سے پوچھ لوں۔" مدعا ظاہر کیا گیا۔ اسے گہری نیند سے جگا کر تشریح پوچھی جا رہی تھی۔ اس کا خون جل کر خاک ہو گیا۔
"دیکھیے مجھے شاعری وغیرہ سے کوئی لگاؤ ہے نہ سمجھ، میں نہیں بتا سکوں گا۔"
اس نے جان چھڑانا چاہی۔
"ہائے اللہ! آپ تو اتنے پڑھے لکھے ہیں، فرسٹ ائیر کے شعر کی تشریح نہیں کر سکتے۔" اس نے حیرانی ظاہر کرنے کے ساتھ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اتنی جلدی جان نہیں چھوڑنے والی۔
"ٹھیک ہے، آپ شعر سینڈ کر دیجیے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" گہری سانس لیتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اور فون بند کر دیا۔
"ان دنوں کچھ عجیب ہے میرا حال

دیکھا کچھ ہوں، دھیان میں پچھ ہے
شعر غور سے پڑھ کر اس نے تشریح کر دی تھی۔
"اتنا سمجھدار ہو کر بھی نہیں سمجھتے۔" اسے میسج موصول ہوا تھا۔
"بہت بیہودہ لڑکی ہو تم۔" اس نے غصے سے لکھا۔
ناکام ہو جاتی ہے میری ہر کوشش تمہاری ناراضی کے آگے
جانے کہاں سے سیکھ لیا تم نے خربوزے جیسا منہ بنانا
کچھ دیر بعد اسے پھر میسج موصول ہوا تھا۔ شدید غصے کے باوجود اسے ہنسی آئی۔ موبائل سائیڈ پر رکھ کر وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆

ادھر یوں ہوا کہ میسجز کا سلسلہ معدوم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا اور وہ جو دادی کو بتانے کا مصمم ارادہ کر بیٹھا تھا، مطمئن ہو گیا۔ مگر شانی کو جانے کون سا روگ لگ گیا تھا، وہ بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتی اور گم بیٹھے چونک پڑتی اور وہ اس کی نیند جو مردوں کو بھی مات دیتی تھی جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ راتیں کروٹ بدلتے گزرنے لگی تھیں، اب اسے معلوم ہوا کہ راتوں کو نیند نہ آئے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اور ایسے تو ویسے بھی نیند سے عشق تھا۔ وہ نجانے زندگی کا کون سا ذائقہ چکھ رہی تھی۔ اپنی بدلتی کیفیت پر وہ خود حیران تھی۔ کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ کئی دن گزر گئے تھے بچوں کے ساتھ کھیلے ہوئے۔ غصہ جو ہر وقت اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا، جانے کہاں اڑ گیا تھا۔
"تجھے کیا ہو گیا ہے شانی۔" دادی اسے دیکھ کر ہولنے لگی تھیں۔ جانے کون کون سے وظیفے پڑھ کر اس پر پھونکتی تھیں۔
"کچھ نہیں دادی۔" ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر سجی تھی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ چند دن پہلے تک جو کرایہ دار اسے سخت زہر لگا کرتا تھا۔ اب اچانک اچھا لگنے لگا ہے کیوں؟ اس راز تک وہ خود رسائی نہیں حاصل کر پائی تھی۔ وہ اس کی منتظر رہنے لگی تھی۔ وہ آتا سلام دعا کرتا چلا جاتا اور وہ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھ بھی نہ پاتی۔ اسے لگتا کہ اگر اس نے اسے دیکھا تو وہ پتھر کی ہو جائے گی۔ ایک شخص اچھا کیا لگنے لگا تھا، زندگی حرام ہو گئی تھی۔

☆......☆

جیسے اچانک بڑے تایا کی آمد ہوئی تھی ایسے ہی اچانک چھوٹے تایا کی آمد ہو گئی۔ آتے ہی شانی کو سینے سے لگا کر ڈھیر سارا پیار کیا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے پھر اس کا اور دادی کا منہ میٹھا کرایا کہ جنید کی جاب لگ گئی ہے۔
"چلو شکر ہے خدا کا۔" دادی نے فوراً شکر ادا کیا۔
"یہ آپ کے اور شانی کے لیے کچھ چیزیں ہیں۔" انہوں نے شانی کو شاپر پکڑایا۔
"اس کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ انہوں نے قدرے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ وہ جب بھی آتے اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتے اور وہ ہمیشہ ان سے وہ سب بڑی خوشی سے وصول کرتی تھی۔

"اماں! ہماری شانی بڑی ہوگئی ہے۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا اور بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ اسے اپنے دونوں تایاؤں میں یہ تایا پسند تھے۔ بڑے تایا عجیب مزاج کے تھے جب اکیلے آتے تو اسے خوب پیار کرتے اور جب تائی کے ساتھ آتے تو سر پر ایک ہاتھ رکھنے پر اکتفا کرتے۔ تائی کے آگے ان کی شخصیت دبی ہوئی سی تھی۔ بڑی تائی مزاج کی تیز تھیں۔ صرف اپنی سناتیں دوسروں کی سننے کی زحمت نہیں کرتی تھیں اور چھوٹی تائی وہ ہمیشہ کی طرح ایسے چہچہاتیں کہ اسے الجھن ہوتی۔

رات کو چھوٹے تایا اور دادی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ سونے چلی گئی۔

"ایاز اور اس کی بیوی آئے تھے۔" اس کے جاتے ہی دادی نے ان کی آمد اور اپنے انکار کے بارے میں بتایا۔ لہجہ جلا ہوا تھا۔

"خیر سے جگنو کی نوکری لگ گئی۔ تم بتاؤ اس کی شادی کے لیے تمہارے کیا ارادے ہیں۔" اپنی سنا کر وہ ان کی پوچھنے لگیں۔

"ابو مجھے سارہ پسند ہے۔" سر جھکا کر اس نے چند سیکنڈوں میں اپنی زندگی کا فلسفہ بیان کر دیا۔

"دیکھا! میں نے کہا تھا ناں۔" بیگم نے فاتحانہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ٹھیک ہے جو تمہاری خوشی۔ اس کا فیصلہ سن کر وہ بجھ گئے تھے مگر بچوں پر زور زبردستی کے قائل نہ تھے سو خاموش ہو گئے۔

ایک ہفتے بعد ہی وہ بیوی کے ساتھ اماں کے سامنے جگنو کی بات پکی کی مٹھائی لیے بیٹھے تھے۔

"اماں! جگنو کو سارہ پسند ہے۔" انہوں نے اماں کے ساتھ بیٹھی شانی کو دیکھتے کچھ جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اچھا ہے تم نے بچے کی پسند کا خیال رکھا۔" دادی نے گہری سانس بھری۔

"اماں! اگلے مہینے منگنی ہے۔ آپ نے ہفتے بھر پہلے آنا ہے۔ آخر آپ کے پوتوں میں جگنو پہلا ہے جس کی منگنی ہوگی۔ منگنی کی رسم آپ نے ہی کرنی ہے۔" وہ اماں کا ہاتھ تھام کر شہد ٹپکاتے لہجے میں بولیں۔

"رہنے دو بی بی یہ دکھاوے کی محبت..... پوتے سے پہلے تو تم نے پوتی کی بات پکی کی اس میں پوچھا کیا بس فون پر اطلاع سنا دی۔" دادی نے ان کے شیریں لہجے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کھری کھری سنا دیں۔

"اماں! سروش کی منگنی کہاں کی تھی یونہی بس مٹھائی کا لین دین کر دیا تھا۔ میں نے تو بہت چاہا تھا کہ گھر کی پہلی خوشی ہے سب جمع ہوں مگر اس کے سسرال والے منگنی پر راضی نہ ہوئے۔" وہ خجل ہو گئیں۔

دادی نے جواب نہ دیا کہ بات شروع ہوئی تو پھر بہت آگے تک جاتی۔

"شانی! چندا کپڑوں وغیرہ کی فکر نہ کرنا میں نے تمہارا جوڑا بھی بننے دے دیا ہے۔" انہوں نے پھر اسی شہد ٹپکاتے لہجے میں شانی کو مخاطب کیا۔ اور سب باتوں سے انجان شانی مسکرا دی۔

☆.....☆

موسم بدل رہا تھا۔ سردی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ اب دھند کی جگہ ہر صبح چمکیلی دھوپ نکلتی تھی مگر شانی جس خول میں قید ہو گئی تھی وہ نہ چٹخا۔ وہ یوں ہی گم صم تھی۔

"مشرفہ بچے۔" دادی نے پیار سے اسے پکارا۔ وہ اس وقت دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹی تھیں۔ شانی پلنگ پر گال کے نیچے ہاتھ ٹکائے کسی سوچ میں مستغرق ان کے پاس لیٹی تھی۔

"جی دادی!" سوچ کی جھیل میں دادی کی آواز نے ارتعاش برپا کیا تو وہ چونکی۔ اب تو وہ مشرفہ نام لینے پر

ان پر جھنجھلاتی بھی نہیں تھی۔

"کیا بات ہے بچے! کئی ہفتوں سے تجھے یوں اداس دیکھ رہی ہوں، کسی سہیلی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟" انہوں نے پیار سے پوچھا تو اسے غصہ آ گیا۔ یہ سیاپا ان کم بختوں کا ہی ڈالا ہوا ہے۔ خود تو آرام سے بیٹھی ہیں مجھے بے چین کر دیا اور مجھے بھی کیا ضرورت تھی ہر بات انہیں بتانے کی اتنی دوستی تو نہیں ہے میری ان سے۔ اس نے سوچا۔ شانی بے چاری اپنی کیفیات پر حیران پریشان تھی۔ ذرا جو ٹی وی اور ناولوں کا اس کی زندگی سے گذر ہوتا تو اپنی کیفیت سمجھ پاتی۔ ایک بار اپنی کسی دوست کو دیکھ کر اسے بھی ناول پڑھنے کا شوق چڑھا تھا۔ وہ اس سے مانگ کر گھر لے آئی۔ دادی نے دیکھا تو جلال میں آ کر پھاڑ ڈالا۔ اسے پیسے بھرنے پڑ گئے۔ بعد میں آرام سے سمجھایا کہ یہ بچوں کے پڑھنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ اچھی باتیں نہیں ہوتی۔ وہ بس احتجاج کر کے رہ گئی کہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے وہ اسے بچی سمجھنا چھوڑ دیں۔ ٹی وی کم بخت ہر وقت کا بیمار تھا اسے چلانے سے پہلے باقاعدہ ڈھول کی طرح پیٹنا پڑتا تھا۔ پھر بھی آدھی تصویر اوپر اور آدھی نیچے آتی تھی۔ شانی نے جل کر چلانا چھوڑ دیا۔ کالج پہنچی تو لڑکیوں کو شاہ رخ خان اور جان ابراہیم کے مرض محبت میں مبتلا پایا۔ کئی دنوں تک تو وہ انہیں ان کا رشتہ دار سمجھتی رہی تھی مگر پھر جلد ہی راز کھل گیا یہ تو فلم ایکٹر ہیں۔ ان کے پاس بولنے کو بے شمار موضوعات تھے۔ ایکٹر، ایکٹریسز، ماڈلز نت نئے فیشن اور یہ نہیں تو اپنے اپنے کزنز کو ہی ڈسکس کرتیں۔ شانی بے چاری ٹکر ٹکر ان کی شکلیں دیکھا کرتی تھی۔ تب دادی سے اس نے بھی ضد کری تھی کہ اسے ایک چھوٹا سا ٹی وی لے دیں۔

"تیرا باوا کیا قارون کا خزانہ چھوڑ کر گیا ہے۔" دادی کو غصہ آ گیا تھا۔

اب دادی اسے کیا بتاتیں کہ اس کی معصومیت برقرار رکھنا ان کے لیے کتنا ضروری تھا۔ وہ اکیلی ہی تو تھیں اس کی دیکھ بھال کرنے کو۔ سوا سے دنیا کی ہوا لگانے کو بھی تیار نہ تھیں۔ وہ اسے کالج بھیجنے پر بھی تیار نہ تھیں، مگر شانی کی ضد کے آگے مجبور ہو گئیں اور شانی کو کچھ اتنا زیادہ شوق تو نہ تھا پڑھنے کا مگر کالج سے دستبرداری کا مطلب تھا گھر میں قید ہونا سو وہ ضد پر اڑی رہی جب تک دادی نے داخلہ نہ کر دیا۔

اب صبح وہ اسے چھوڑنے جاتیں تو دوپہر کو وہ گلی کی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ آ جاتی۔

شانی۔" دادی نے پھر پکارا، وہ چونک کر حال میں پلٹی۔

"نہیں دادی میرا کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیا بات ہے۔" وہ پریشان تھیں۔

کوئی بات نہیں دادی! اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔" ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے اس نے جیسے انہیں راز کی بات بتائی۔ دادی ہنس پڑیں۔

"کتنے دن ہو گئے شانی! تو نے اپنے ہاتھوں سے کچھ پکا کر نہیں کھلایا۔" دادی نے کہا۔

"کیا کھانا ہے آپ کو۔" وہ سرعت سے اٹھ بیٹھی۔

"جو تیرا جی چاہے۔" دادی مسکرا دیں۔ وہ فوراً کچن میں جا پہنچی۔

"بھاڑ میں ڈالو اس کرائے دار کو کتنے دن ہو گئے کوئی بھی کام ڈھنگ سے کیے ہوئے۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا۔ پھر اس نے بڑے اہتمام سے فرائیڈ رائس پکائے۔ میاسے رفو نے پکانا سکھائے تھے۔

پلیٹ میں چاول نکالے اور ٹرے میں رکھ کر باہر آ گئی۔

"دادی! میں یہ اوپر دے کر آتی ہوں۔" وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔
"لے، ابھی اوپر وہ گیا ہے اسے ہی پکڑا دیتی۔" دادی نے گھورا۔
"وہ نہیں ہوئے تھے۔" وہ منمنائی۔
"آؤ فیضی۔" پڑھتے ہوئے بچے کو اپنے ساتھ آنے کا کہہ کر اس نے قدم بڑھا دیے۔ پیچھے دادی پر سوچ نظروں سے تکتی رہیں۔ دستک پر دروازہ کھولتے اس پر نظر پڑتے ہی وہ گڑبڑا گیا تھا۔ اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط رہنے لگا تھا۔ اس نے ٹرے اسے پکڑائی۔ اس نے شکریہ کے ساتھ تھام لی اور کچن میں رکھنے چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ کمرے میں کھڑی جائزہ لے رہی تھی۔
"کتنا گندا ہو رہا ہے کمرہ، آپ صفائی نہیں کرتے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
"ٹائم ہی نہیں ملتا۔" اس نے سر جھکا کر مجرموں کے سے انداز میں کہا۔ جبکہ دل چاہ رہا تھا کہ ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے سے باہر کر دے اور اپنا رکا ہوا سانس بحال کرے۔
"میں صفائی کر دوں۔" اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔
"جی..... نہیں نہیں بہت شکریہ آپ کا، میں خود کرا لوں گا۔" وہ یکدم گھبرا گیا۔ آگے بڑھتے ہوئے باہر کی سمت اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئی تو اس نے سرعت سے دروازہ بند کر دیا۔
اس نے جس طرح سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا تھا اسے ذرا اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ اس کی وجہ بھی جانتی تھی۔ دادی ناشتہ بنا رہی تھیں اور ان کے قریب ہی وہ اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ دروازہ پر دستک ہوئی تو وہ تیر کی طرح گئی اور دادی کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔
"سنیں!!" اس کے ہاتھ میں برتن پکڑاتا وہ پلٹا تو وہ پکار بیٹھی مجبوراً وہ مڑا تھا۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس کی پیشانی پر بل نمودار ہو گئے۔
"اب اس نے کچھ فضول بات کی تو میں طبیعت صاف کر دوں گا۔" اس نے سوچا۔
"وہ..... دراصل مجھے آپ سے معافی مانگنا تھی۔" کچھ جھجکتے ہوئے وہ گویا ہوئی۔
"معافی....." اس نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔
"ہاں..... وہ آپ کے چائے میں نمک ملایا تھا میں نے اور آپ کی بیماری میں آپ کو اچار پلایا تاکہ آپ مزید بیمار ہو جائیں اور کتنے دن آپ کو تنگ بھی کیا ان سب باتوں کی معافی مانگنی ہے مجھے..... میں بہت شرمندہ ہوں۔" بغیر اٹکے ایک سانس میں اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کیا تھا۔
"یہ سب جو آپ نے میرے ساتھ کیا ان سب کی وجہ جان سکتا ہوں۔" بغور ایک نظر اس کے شرمندہ چہرے پر ڈال کر اس نے پوچھا۔
"میں نہیں چاہتی تھی آپ یہاں رہیں۔" اس نے بلا تامل وجہ بتائی۔
"اب بھی یہی چاہتی ہیں آپ۔" اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"اب تو میں چاہتی ہوں آپ ہمیشہ یہیں رہیں۔" اس نے دل میں کہا۔
"نہیں، جب تک آپ کا دل چاہے رہیں۔" اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔
"آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ مجھے جلد ہی گھر مل جائے گا اور میں چلا جاؤں گا۔" وہ کہتا ہوا جانے کو مڑا۔ "اور ہاں..... آپ شرمندہ ہیں بس اتنا کافی ہے۔" ذرا سا رک کر وہ مخاطب ہوا اور جانے کو

قدم بڑھا دیے۔ پیچھے وہ ساکت کھڑی اس کی پشت تکتی رہ گئی۔

"تجھے کیا گیٹ نے پکڑ لیا تھا۔" دادی کا انداز برہم تھا۔

"مجھے کچھ پوچھنا تھا اس سے، وہ پوچھ رہی تھی۔" وہ برتن رکھ کر نگاہیں چراتی جلدی سے کچن سے نکل گئی مبادا وہ کوئی اور سوال کر دیں۔

اس نے جب سے اپنے جانے کے بابت بتایا تھا اس کے دل کو پنکھے لگ گئے تھے۔

"کیا وہ اس وجہ سے جا رہا ہے کہ میں نے اسے ستایا، ہاں تو یہی تو میں چاہتی تھی اب جا رہا ہے تو بھی اس دل کو چین نہیں، نجانے کیا ہو گیا ہے مجھے۔" کالج میں سارا دن اس کا سوچتے ہوئے گزرا تھا۔

"مجھے اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہیے۔" اس نے ایک نظر اپنے برابر میں سوئی ہوئی دادی کو دیکھا اور احتیاط سے کھڑی ہوئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ تالا وغیرہ لگانے کے تکلف میں نہ پڑا تھا کہ کمرے میں کون سا خزانہ مدفون تھا۔ ایک پلنگ کے آگے بچھا ایرانی غالیچے کا ٹکڑا اور چھت پر لٹکا پنکھا، یہ اس کمرے کل سامان تھا۔

کمرے میں بے ترتیبی، دھول، گندگی حد سے سوا تھی۔ بستر کی چادر آدھی پلنگ پر اور آدھی نیچے لٹک رہی تھی۔ پلنگ کے نیچے ناشتے کے برتن ڈھیر تھے۔ تکیے فرش پر پڑے تھے فرش پر بلکہ ہر چیز پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ چھت کے کونوں میں بڑے بڑے جالے لٹک رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جس دن سے اس نے اس کمرے میں قدم رکھا ہے صفائی کی نوبت نہیں آئی۔ رہ گئی کمرے کے وسط میں کھڑی شانی، تو وہ یہاں صفائی کی نیت سے ہی آئی تھی۔

آگے بڑھ کر اس نے پلنگ کی چادر اٹھا کر جھاڑی گرد کا ایک مرغولہ سا اڑا اور کوئی چیز شانی کے قدموں میں گری۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ کوئی تصویر تھی۔ اس نے جھک کر تصویر اٹھاتے ہوئے اسے پلٹا۔ اگلے پل وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ تصویر میں اس کا مسکراتا چہرہ نمایاں تھا مگر شانی کی نگاہیں اس کے کاندھے سے لگی اس لڑکی پر جمی تھیں جس کے شانے پر اس کا بازو دراز تھا۔ وہ لڑکی بھی اسی کی طرح بے حد خوبصورت تھی۔ شانی نے تصویر چادر میں رول کر کے پلنگ پر پھینکی اور اپنے من بھی ہوتے وزنی قدموں سے نیچے چلی آئی۔ نیچے آخری سیڑھی پر بیٹھ کر وہ ماتم کناں تھی۔ اس کے آنسو بے آواز نکل کر گالوں پر پھیل رہے تھے۔ ابھی تو وہ اسے اچھا لگنے شروع ہوا تھا ابھی یہ کیا ہو گیا۔ اسے خدا سے بہت شکوے تھے کہ اس نے اس کے ماں باپ دونوں کو اتنی جلدی اپنے پاس بلا لیا۔ اس کو کوئی بہن بھائی نہیں دیا جو اس کی تنہائی بانٹتا۔ اب اس میں اس ایک شکوے کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

☆.....☆

وہ بے حد مضمحل اور وحشت زدہ سی تھی۔ گھر کے در و دیوار گویا کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ فرار چاہتی تھی چاہے کچھ دنوں کے لیے ہی سہی۔ جگنو کی منگنی میں ہفتہ باقی رہ گیا تھا سو وہ دادی کے سر ہوئی۔

"اتنے دن پہلے جانے کی کیا تک ہے، ایک دن پہلے چلیں گے۔" دادی نے غصے سے گھورا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ مجھے تو ابھی جانا ہے۔ تائی بھی تو کہہ کر گئی تھیں۔ آپ میری کوئی بات نہیں سنتیں۔" دل تو ویسے ہی بھرا ہوا تھا فوراً آنسو امڈ آئے۔ دادی پسیج گئیں۔ جمشید سے کہہ کر فوراً ٹکٹ منگوائے۔ جہان کی طرف سے وہ مطمئن تھیں۔ کچھ ہدایات کے ساتھ جمشید کو گھر کی چابی دی۔ بیٹے کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور

گاڑی پر سوار ہو گئیں۔
جنید انہیں لینے آیا تھا۔ شانی پر نظر پڑتے ہی پل بھر کو ساکت ہوا۔ سیاہ چادر میں لپٹا اس کا چہرہ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا ہوا چاند۔ اسے ملال نے آگھیرا، وہ دادی کے پہلو سے لگی ہراساں سی کھڑی تھی اور دادی نے اس کا ہاتھ کچھ یوں دبوچ رکھا تھا جیسے کسی کے اچک لے جانے کا خوف ہو۔
گھر میں استقبال تو پرجوش طریقے سے ہوا تھا مگر جلد ہی جوش دم توڑ گیا۔ انہیں الگ کمرہ دیا گیا تھا۔ گھر کے مکین اپنی اپنی مصروفیت میں گم ہو گئے۔ کسی کے پاس ان کے لیے وقت نہ تھا صرف چھوٹے تایا جو آفس سے آنے کے بعد کچھ دیر دادی کے پاس بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جگنو تھا جب سے اس نے شانی کو دیکھا تھا، ہزار بار خود کو کوس چکا تھا۔ اچھا خاصا ہنس مکھ لڑکا ہوتا تھا اب بے زار سا گھومتا۔
سروش تھی جو کبھی اپنے ناخن سجاتی اور کبھی اپنے میدے جیسی سفید رنگت کو مزید سفید کرنے کے جتن کرتی۔ اس کا قد کچھ کم تھا، تبھی بھی کچھ گول گول سی شانی اسے خرگوش کہا کرتی تھی۔ رہ گئیں تائی تو وہ سارا دن بیٹھ کر کام کا رونا روتیں "ہائے اماں کتنا دل چاہتا ہے آپ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کو مگر یہ کام جان ہی نہیں چھوڑتے۔"
شانی نے ایک دن ان کا رونا سنا اور پھر کئی چھوٹے موٹے کام اپنے ذمے لے لیے، انہوں نے رسماً بھی منع نہ کیا بلکہ مزید کاموں کا بوجھ اس پر لاد دیا۔ دادی اسے دیکھ کر کڑھتیں اور وہ ان سے آنکھیں چرائے پھرتی کہ آنے کی ضد بھی تو اسی کی تھی۔
منگنی میں دو دن تھے کہ بڑے تایا کے بچے بھی آ گئے۔ تایا تائی کو منگنی والے دن آنا تھا بڑے تایا کے پانچ بچے تھے۔ دو بیٹے تین بیٹیاں۔ وہ تینوں سروش کے کمرے میں ٹھہری تھیں شانی کو دکھ ہوا سروش نے ایک بار بھی رسمی طور پر بھی اسے اپنے کمرے میں رکنے کو نہیں کہا تھا۔
وہ شام کی چائے سب کو پیش کر کے ابھی بیٹھی تھی۔
"شانی چائے پلیز۔" وہ سب سروش کے کمرے میں ڈانس کر رہی تھیں جب ساریہ نے کمرے کا دروازہ کھول کر وہیں سے ہانک لگائی۔
"چائے ختم ہو گئی۔" وہ بیحد تھک گئی تھی۔
"تو اور بنا لو۔" بے نیازی سے جواب دیا گیا۔ وہ سر ہلاتی ہوئی کھڑی ہوئی۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے، بیٹھو آرام سے۔" دادی کے برابر میں بیٹھی ہوئی سحر نے ڈپٹ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ وہ بڑے تایا کی سب سے بڑی بیٹی تھی، اظفر سے چھوٹی تھی۔ اس سے چھوٹی ساریہ پھر صبا اور پھر اظفر تھا۔
"جسے چائے پینی ہے خود بنائے اس نے ابھی کھانے کے اتنے ڈھیر برتن دھوئے ہیں۔" سحر کے کہنے پر ساریہ نے منہ بناتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بھی اٹھ کر سروش کے کمرے میں چلی آئی۔
"پرابلم کیا ہے تم لوگوں کے ساتھ وہ نوکر ہے کیا تمہاری؟" میوزک کو بند کرتے ہوئے سحر نے تینوں کو گھورا۔
"اتنے سالوں بعد آئی ہے وہ، مہمان ہے۔ بجائے اس کی مہمان نوازی کرنے کے تم لوگوں نے اپنے کام بھی اس کے سر ڈال دیے۔ وہ بھی ہماری کزن ہے، بجائے اس کے تم لوگ اس کو اچھی کمپنی دو تم مسلسل اس کو اگنور کر رہی ہو۔" اس نے انہیں شرمندہ کرنا چاہا تھا۔
"اس پینڈو کو کوئی کیا کمپنی دے گا۔" سروش کے بڑبڑانے پر اس نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔
"سروش آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں شانی کو کچھ نہیں پتا نہ فنکشن کے بارے میں نہ موویز کے بارے میں، جانے

ہی دنیا میں رہتی ہے اس سے کوئی کیا بات کرے۔" صبا نے کہا۔
" یہ سب جو تم اس کے بارے میں سوچتی ہو اسے مسلسل نظر انداز کر رہی ہو تمہیں کیا لگتا ہے وہ سمجھتی نہیں ہوگی۔ وہ سادہ اور معصوم ہے پر بیوقوف ہرگز نہیں ہے۔" اس نے قدرے غصے سے کہا۔
" ہمیں فرق نہیں پڑتا۔" ماریہ نے کندھے اچکائے۔
" پر مجھے فرق پڑتا ہے اسے اپنے بیچ تھوڑی سی جگہ دو گی، تو بات کرنے کے لیے ٹاپک سوچنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔" اس کے جانے کے بعد تینوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔ سحر کا کہا تو انہیں ماننا ہی تھا۔ اس کی ناراضی بہت سے معاملات میں انہیں بھاری پڑ سکتی تھی۔

☆......☆

شام کو لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی۔ جگنو کے ننھیال والے بھی آ گئے تھے۔ ڈھولک بجاتے بجاتے سحر نے اچانک ہاتھ روک کر دادی کے ساتھ بیٹھی شانی کو آواز دی۔
" آؤ ناں تم بھی ساتھ دو ہمارا۔" اس کے قریب آنے پر وہ بولی۔
" پر سحر آپی مجھے گانا نہیں آتا۔" وہ گھبرا گئی سب کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ آ گئی۔
" کوئی بات نہیں شانی ڈیئر، یہاں گانا کسی کو بھی نہیں آتا۔" اس نے اپنے قریب ہی اسے بٹھا لیا تھا۔

☆......☆

چھوٹی تائی نے منگنی کے فنکشن کے لیے اس کے لیے سفید جارجٹ کا فراک پاجامہ بنوایا تھا، جس پر سرخ دھاگے سے کام بنا ہوا تھا، اس کا لباس سروش جتنا قیمتی تو نہ تھا پر کیا گزرا بھی نہیں تھا بہر حال اسے پسند تھا۔ لڑکیاں سروش کے کمرے میں تیار ہو رہی تھیں۔ سحر سب کو تیار ہونے میں مدد دے رہی تھی۔
" جلدی کرو شانی! دیر ہو رہی ہے آٹھ بجے تک ہال میں پہنچنا ہے۔" سروش کے بالوں میں آخری پن لگاتے ہوئے اس نے شانی کو دیکھا، جو نیا لباس زیب تن کیے کونے میں بیٹھی سب کی تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔
" لیں میں تو کب کی تیار ہوں۔" اس کی بات پر قدرے تعجب سے سب نے اسے دیکھا بالوں کی ڈھیلی ڈھالی سی چوٹی کیے آنکھوں میں ذرا کا جل ڈالے شانی میڈم بالکل تیار تھیں۔
" تم اس میں بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔" سحر ہنسی وہ جھینپ گئی۔
سب تیار ہو گئے تھے صرف سحر رہ گئی تھی وہ بھی سب کے ساتھ نکل رہی تھی جب سحر نے روک لیا۔" تم رکو میرے ساتھ چلنا۔" وہ وہیں بیٹھ کر اس کے تیار ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے کے بعد اس نے شانی کو ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بٹھایا۔
" یہ کیا کر رہی ہیں؟" اس نے اسفنج اس کے چہرے پر پھیرنا شروع کیا تھا کہ وہ گھبرا گئی۔
" میک اپ چپ کر کے بیٹھو ورنہ لائنر پر، جائیں گی۔"
" وادی ڈانٹیں گی۔"
" کہہ دینا میں نے کیا ہے۔" وہ مصروف لہجے میں بولی۔ دس منٹ بعد وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی تو وہ حیرانی سے خود کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی چوٹی تھامے سحر اسٹائل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے بال بے حد لمبے تھے۔
" یونہی ٹھیک ہیں۔ کھولوں گی تو نظر لگ جائے گی۔" اس کی چوٹی اس نے شانے پر ڈالی تھی۔

وہ ڈرتی ہوئی سحر کے ساتھ دادی کے پاس چلی آئی دادی نے کچھ نہیں کہا بس دعا پڑھ کر اس پر اور سحر پر پھونک دی۔

منگنی کی رسم دادی نے کی تھی اور جگنو کی بے زاریت دیکھ کر دادی کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ جگنو کو سارہ کتنی پسند ہے۔

ایک شخص تھا جس کی نظریں بس شانی کا ہی طواف کر رہی تھیں اور وہ تھا اظفر۔

"یہاں آؤ۔" سحر اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لائی تھی۔

"کیا ہوا؟" شانی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"سامنے دیکھو۔" اس نے گدھوں کی طرح ادھر ادھر نظر گھمائی۔

"ارے سامنے اس بلیک سوٹ والے شخص کو جو وائٹ والے شخص سے باتیں کر رہا ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں کیا ہوا اسے؟" اسے مطلوبہ شخص نظر آ گیا تھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوا، وہ میرے منگیتر ہیں۔" اس نے ماتھا پیٹا تھا۔

"یہ تو بہت اچھے ہیں۔" اس شخص کو بغور دیکھنے کے بعد وہ خوشی سے بولی۔

"آپ کے ساتھ تو بہت اچھے لگیں گے۔"

"اللہ سے دعا ہے کہ ایسا ہی پیارا سا شخص وہ جلد ہی تمہیں بھی دے دے۔" سحر مسکرائی وہ جھینپ کر اندر بھاگی۔

"کیا ہی اچھا ہو اگر اظفر اپنا قبلہ درست کر لے۔" اس نے رک کر جنید سے باتیں کرتے اظفر کو دیکھ کر سوچا اور پھر اندر چل دی۔

☆.....☆

اظفر کے مجبور کرنے پر شمسہ اماں سے دوبارہ بات کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں سب ہی موجود تھے۔

"بڑی بہو! میں پہلے ہی انکار کر چکی ہوں۔" دادی نے تحمل سے ان کی بات سننے کے بعد کہا۔

"اماں! یہ اظفر کی خواہش ہے۔" غصہ دباتے ہوئے وہ بظاہر میٹھے لہجے میں بولیں۔

"چاہے کسی کی بھی خواہش ہو۔" دادی نے ذرا لچک نہ دکھائی۔

"آخر آپ، وجہ تو بتائیں اظفر میں کیا برائی ہے۔" وہ جھلائیں۔

"برائی.....! یہ کیا کم برائی ہے کہ وہ کچھ کرتا نہیں ہے باپ کا پیسہ اتنی پڑھائیوں میں جھونکا کیا فائدہ ایسی پڑھائی کا جو کسی کے کام نہ آئے۔" دادی نے بالآخر لب کشائی کی۔

"اماں! وہ چھوٹی موٹی نوکریاں نہیں کرنا چاہتا، اپنا بزنس کرے گا۔" وہ ساس کے قریب ہوتے ہوتے لجاجت سے بولیں۔

"اور وہ کاروبار کیسے ہوگا، وہ مکان بیچ کر۔" دادی کی بات پر دونوں میاں بیوی کو سانپ سونگھ گیا۔

"کان کھول کر سن لو، کوئی اس گھر پر بری نیت نہ رکھے۔ باپ کے مرنے کے بعد یوسف نے تم دونوں کے حصے ادا کر دیے تھے۔" انہوں نے شانی کے والد کا نام لیا۔

"اماں! آپ الزام لگا رہی ہیں ہم پر۔" بڑی بہو کو اچانک ہوش آیا تو چمک کر بولیں۔ دادی نے جواب نہیں دیا۔ وہ مزید شیر ہو گئیں۔

"آپ نے ہمیشہ فرق کیا ہم بہوؤں میں، اب بچوں میں بھی فرق کر رہی ہیں۔ آپ نے ہم دونوں کے آگے ہمیشہ اس لاوارث کو اہمیت دی۔" وہ بات کو کسی اور ہی رخ لے گئیں۔ تیز ہوتی آوازوں پر ڈرائنگ روم سے ملحق کمرے میں بیٹھی شانی چونک کر کھڑی ہو گئی۔ سحر نے اسے دوبارہ بٹھا دیا۔

"خبردار بہو! اسے لاوارث کہا تو وہ لاوارث نہیں تھی۔" دادی کو جلال آ گیا۔

"میں نے کبھی تم لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا، انسان اپنی قدر اور محبت خود کراتا ہے اور رومیصہ نے بھی اپنی قدر خود کرائی اور تم..... تمہاری کوئی کیا قدر کرے گا دوسرے سال تو تم لڑ جھگڑ کر علیحدہ ہو گئی تھیں۔ تم نے زبان کے جوہر دکھائے تھے چھوٹی نے میٹھی چھری سے سب کو حلال کیا۔

انہوں نے چھوٹی بہو کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ ایاز بیوی کو چپ کرانے لگے تو فیاض اماں کو شانت کرنے لگے۔

"میں نے..... میں نے دور کر دیا ہے آپ کے بچوں کو تو ٹھیک ہے اب تو میں آپ کو ان کی شکلیں دیکھنے سے بھی ترسا دوں گی۔" وہ چپ ہونے میں نہیں آ رہی تھیں، شانی نے گھبرا کر رونا شروع کر دیا۔ سحر اسے سروش کے کمرے میں لے آئی۔

"چپ ہو جاؤ شانی بڑوں کی باتیں ان ہی کے بیچ رہنے دو خود کو ہلکان مت کرو۔" سحر اسے چپ کرانے لگی سروش اس کے لیے پانی لے آئی۔

"تائی نے میری امی کو لاوارث کیوں کہا؟" پانی پی کر گلاس سحر کو پکڑاتے ہوئے وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"امی کی تو عادت ہے، بنا سوچے سمجھے کچھ بھی بول دیتی ہیں مگر دیکھو دادی نے بھی ڈانٹ دیا ہے ناں انہی طرح طبعیت صاف کر دی ہے۔" وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے بولی تھی۔

دادی اگلے ہی دن گاڑی پر سوار ہو گئیں شانی خاموش تھی اس نے دادی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا دادی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں گھر آ کر شانی سے مزید صبر نہیں ہوا تھا۔

"دادی.....! تائی امی نے میری امی کو لاوارث کیوں کہا؟" اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔

"کچھ نہیں، تو تو جانتی ہے وہ مزاج کی کتنی تیز ہے کچھ بھی بول دیتی ہے۔"

"ایسے ہی تو نہیں کہا ہو گا۔ میں نے تو اپنے ننھیال میں کسی کو نہیں دیکھا۔" اس کا لہجہ دل گیر تھا۔

"کتنی بار تو بتایا ہے تجھے تیرے ننھیال کے بارے میں رومیصہ کا بہن بھائی کوئی ہے نہیں تیرے نانا نانی کو خدا نے جلد اپنے پاس بلا لیا اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تیری ماں لاوارث تھی۔ خدا سب کا وارث ہے۔ تیری تائی کو تو عادت ہے بک بک کرنے کی، تو دھیان نہ دے میرے بچے۔" دادی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

دن بدن شانی کا مزاج عجیب ہوتا جا رہا تھا دادی فکر مند ہو گئی تھیں اس کا غصہ جو کہیں غائب ہو گیا تھا اب عود آیا تھا، وہ اکثر جھنجھلا کر بچوں پر ہاتھ اٹھا بیٹھتی، دادی ہائیں ہائیں کرتی رہ جاتیں وہ لاابالی طبعیت کی تھی اسے بچوں کے ساتھ ہلا گلا کرنا پسند تھا مگر اب وہ بے حد خاموش ہو گئی تھی۔

گھر کے کاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔ دادی نے بہتیری کوششیں کی تھیں اسے سگھڑ بی بی بنانے کی اور مثالیں دیا کرتی تھیں کہ وہ بگڑے کام منٹوں میں سنوار دیا کرتی تھی مگر شانی تو بنا بنایا کام

بگاڑنے میں ماہر تھی اور وہ بھی شرمندہ بھی نہیں ہوتی تھی، نہ ان کی مثالوں نصیحتوں پر کان دھرا کرتی تھی۔ مگر اب وہ ہمہ وقت کام میں مصروف رہنے کی کوشش کرتی یا پڑھائی میں مصروف ہو جاتی یہ سب دادی کی باتوں کا اثر نہ تھا بلکہ ان کا سبب وہ فالتو سوچیں تھیں جن سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے کاموں میں پناہ ڈھونڈی تھی۔

"یہ شخص چلا کیوں نہیں جاتا اب۔" وہ ابھی اوپر گیا تھا اور وہ جھنجلا کر سوچ رہی تھی روز وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور روز اس کے سامنے پر اس کے دل کا زخم ہرا ہو جاتا تھا۔

اسے ہفتہ بھر کے لیے سرکاری کام سے کراچی جانا تھا شانی نے سنا تو سکون کا سانس لیا دادی نے اسے دعاؤں کے سنگ رخصت کیا تھا۔ مگر وہ ہفتے کا کام چار دن میں نمٹا کر ان کے سامنے بیٹھا تھا کچھ تحفوں اور لوازمات کے ساتھ۔ شانی اسے دیکھتے ہی کچن میں چلی گئی گرم دوپہر تھی اس نے لسی بلوئی اور ٹرے لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ "یہ آپ کے لیے۔" اس نے رسٹ کلر کا خوبصورت اسٹائلش سوٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"آپ کا شکریہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔" وہ رکھائی سے کہتی پلٹ گئی وہ ہکا بکا اسے جاتا دیکھتا رہا تھا پھر کچھ شرمندہ ہو کر اس نے وہ سوٹ تخت پر رکھ دیا۔

"وہ ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا اس کی واقعی ضرورت نہیں۔" اس کی شرمندگی زائل کرنے کو دادی نے نرم لہجے میں کہا۔

"اور دیکھو سردیاں تو ختم ہو گئیں تم نے اس شال پر بلا وجہ ہی روپے برباد کیے۔" دادی مسکرائیں۔

"میری اپنی کوئی فیملی نہیں میں آپ لوگوں کو ہی اپنی فیملی سمجھتا ہوں، کبھی کسی کے لیے شاپنگ نہیں کی اس لیے جو سمجھ آیا اٹھا لیا۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ اس اپنائیت کا بچے۔" دادی نے شال اٹھا کر اپنی گود میں رکھی تھی وہ کھل کر مسکرا دیا۔

"یہ سوٹ دے دیجیے گا شانی کو۔" اس نے بہت محتاط انداز میں شانی کا نام لیا تھا دادی نے چونک کر اسے دیکھا اور پرسوچ انداز میں گردن ہلا دی۔

اسے سرکاری گھر مل گیا تھا مگر وہ یہاں سے جا نہیں پایا تھا سرکاری گھر میں اسے آسائشات تو ساری ملتیں مگر دادی جیسی اپنائیت اور محبت کرنے والا کوئی نہ ہوتا اور پھر شانی بھی تو تھی، جس کی شرارتوں اور بیوقوفیوں کا اب وہ منتظر رہتا تھا۔

☆......☆

دادی نے چند دن غور و فکر میں گزارے اور پھر جمشید کو بلا بھیجا۔ شانی کو مطلق فکر نہ تھی کہ دادی جمشید سے کیا راز و نیاز کر رہی ہیں۔ جمشید انکل کی تواضع کے بعد اس نے روٹی ڈالی گرمی محسوس ہوئی تو نہانے چلی گئی۔ کھانے کے بعد وہ دادی کے ساتھ صحن میں بچھے تخت پر لیٹ گئی دادی جلد سو گئی تھیں اور وہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کی گنتی کر رہی تھی۔ آج کل اس کی آدھی رات یونہی نیند کے انتظار میں تارے گنتے گزرتی تھی۔

آفس کے بعد جمشید اسے لیے قریبی ریسٹورنٹ چلے آئے تھے۔

"کہیے انکل! کیا بات ہے؟" چائے کا آرڈر دینے کے بعد اس نے ان کی طرف دیکھا وہ مسکرا دیے۔

آفس میں وہ ان کا باس تھا اور انہیں جمشید صاحب یا مسٹر جمشید کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ مگر آفس کے بعد وہ اس کے لیے جمشید انکل ہوتے تھے اور اس تکلف اور بے تعلقی کو وہ بہت اچھے طریقے سے بینج کرتا تھا وہ اچھی شخصیت اور اچھے اخلاق کا حامل شخص تھا ایماندار تھا کبھی اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ غور سے اسے

کہتے ہوئے ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔
"کب تک اس طرح اکیلے رہنے کا ارادہ ہے تمہارا۔" ان کے سوال پر وہ مسکرا دیا پھر شرارت سے بولا۔
"خیریت کوئی رشتہ وشتہ تلاش کیا ہے کیا آپ نے میرے لیے۔"
"ایسا ہی سمجھ لو۔" وہ بھی مسکرا دیئے۔
"نام پتہ عرض کیجیے۔"
"اونہوں..... ایسے نہیں پہلے تم بتاؤ شادی وغیرہ کا کوئی ارادہ ہے بھی یا....." انہوں نے شرارتاً بات ادھوری چھوڑ دی۔
"اب آپ نے لڑکی ڈھونڈ لی ہے تو اس بابت سوچا جا سکتا ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میرے جیسے آدمی کے لیے خود لڑکی تلاشنا پہاڑ سر کر دینے کے مترادف ہے۔" جمشید چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور پھر جو اسے لڑکی کی بابت بتایا تو وہ اچھل پڑا تھا چائے اس کی شرٹ پر چھلک گئی تھی۔ "وہ تو بہت چھوٹی ہے۔" اس نے تحیر سے انہیں دیکھا۔
"ہوں..... سات آٹھ سال کا فرق تو ہوگا۔" انہوں نے خیال ظاہر کیا۔
"زیادہ کا بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"تمہیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں شانی ہے تو کم عمر مگر سمجھدار بچی ہے اور ویسے بھی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ایسے جوڑے اپنی زندگی میں زیادہ خوش و خرم رہتے ہیں جن میں مرد بڑی اور لڑکی کم عمر ہو۔" وہ مزاحیہ انداز میں بولے۔
"اور میرا اس تحقیق کو خود پر آزمانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"مگر اس تحقیق میں شامل ہونے کے بارے میں سوچا تو جا سکتا ہے۔" ان کے کہنے پر وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔
سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیوار کے پار موڑھے پر بیٹھی ہوئی شانی پر اس کی نظر پڑی نیچے بچے دری پر بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے وہ رک کر اسے بغور دیکھنے لگا، اس کی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے دیکھنے پر اس نے پلکیں جھپکائیں تھیں نا نظریں ہٹائیں تھیں شاید وہ کسی سوچ میں غرق تھی۔ اس کے چہرے پر نوعمری کی معصومیت تھی، سیاہ دراز چوٹی کاندھے پر پڑی تھی وہ زیر لب مسکراتا ہوا اوپر آ گیا۔
وہ مسلسل اسے سوچ رہا تھا وہ زندگی کے ہر رنگ سے بچی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے غصے میں اس کا پاؤں پٹخنا دیکھا تھا تو صحن میں اسے بچوں کے ساتھ کدکڑے لگاتا بھی دیکھا تھا۔ اس کی بدتمیزی ملاحظہ کی تھی، تو خوش اخلاقی کے ساتھ اس کے ہاتھ کا ذائقہ بھی چکھا تھا۔ اسے تنگ کرنے کے اس نے نئے نئے حربے آزمائے پھر معصومیت کے ساتھ اس کا اعتراف جرم بھی سنا تھا۔ اور پھر اسی صحن میں اس نے اسے سنجیدہ کسی بات پر پریشان اور اپنے آپ میں گم بھی دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں فیصلہ ہو گیا تھا زندگی کے اتنے رنگوں میں رنگی اس لڑکی کو وہ اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆.....☆

اس نے دیر نہیں کی تھی، اگلے ہی دن اس نے اپنی ہاں جمشید کو پہنچائی تھی انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی مان جائے گا۔ محض دو دن میں دادی کو حسب منشاء جواب مل گیا تھا۔

شانی نے سنا تو سن ہو کر رہ گئی وہ ساکت کھڑی تھی۔ دادی کی پوری توجہ اس وقت موزف سے ہٹ کے شانی پر تھی۔ شانی کی طرف متوجہ ہوئیں تو ضرور اس کے رد عمل پر چونکیں "غضب خدا کا موزف کے ساتھ آ رہے تو کیسے دل دیتے ہیں۔" دادی بڑبڑائیں وہ آہستگی سے چلتی دادی کے قریب آ گئی۔

"دادی میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

"لیکن کیوں ....." دادی کو گویا کرنٹ چھو گیا تھا۔ موزف کی تھالی ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی آنکھوں کے سامنے اس لڑکی کی تصویر لہرا رہی تھی۔

دادی کو یقین تھا کہ یہ خبر سن کر اس کے چہرے پر حیرت، خوشی اور انبساط کے رنگ ہوں گے مگر وہ حیران تو تھی، اسی طرح پژمردہ تھی، اگر اس نے اس کے ساتھ اس لڑکی کی تصویر نہ دیکھی ہوتی، تو یقیناً اس وقت وہ خوشی سے دادی سے لپٹی ہوتی۔

"تجھے تو وہ پسند تھا شانی۔" دادی نے پریشانی کے عالم میں اسے دیکھا انہیں دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ دادی کی بات پر وہ اچھل پڑی۔

"آپ سے کس نے کہا کہ مجھے وہ پسند ہے۔" اس نے جس طرح نظریں چرائیں تھیں۔ دادی کا خیال پختہ ہوا تھا۔

"ہاں مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے کہنے سننے کی میں آنکھیں رکھتی ہوں یہ تیرے تیور یونہی تو نہیں بدلے تھے۔" دادی خفا ہو گئیں، شانی نے پرزور نفی کرنے کے لیے منہ کھولا تھا۔

"میں نے خود ہی بات کی اور اب خود ہی منع کر دوں؟ کہ تیرا مزاج پل میں کچھ اور پل میں کچھ ہوتا ہے زبان کی بھی کوئی وقعت ہوتی ہے۔ میں آج ہی جمشید کو بلا کر سارے معاملات طے کرتی ہوں۔" دادی اٹل تھیں تو وہ آنسو بہاتی رہی، آنسو دیکھ کر دادی کا دل کچھ پسیجا تھا۔ "وہ کیا بات ہوگی شانی بچے؟ اگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

ایک بار پھر نظروں کے سامنے اس لڑکی کی تصویر لہرائی تھی۔ مشکل تھی وہ دادی کو کس منہ سے بتاتی کہ وہ جب سے اس کے کمرے میں گئی تھی، دادی نے اسے تہمت سے الٹا لٹا دیا تھا۔ وہ بے بسی سے آنسو صاف کرتی اٹھ گئی۔

اس کے ہاں کر دینے پر وہ شدید الجھی ہوئی تھی۔ انکار کرنے کے لیے دادی کی کئی بار منتیں کر چکی تھی۔ سنگین دھمکیاں بھی دی تھیں مگر دادی پر چنداں اثر نہ ہوا تھا۔ دادی بیوقوف نہ تھیں کہ اتنے اچھے رشتے کو ہاتھ سے جانے دیتیں۔ محض اس کی کم عقلی کے باعث پہلے ان کا ارادہ نکاح اور پھر سال ڈیڑھ بعد رخصتی کا تھا مگر اب تو شانی کے واویلے کے باعث وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔ شانی سے کچھ بعید نہ تھا۔

اسے زور زبردستی صفوراں نانی کے گھر بھیج کر دادی جمشید انکل کے ساتھ سارے معاملات طے کر رہی تھیں۔

"دیکھو میاں زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میں جلد از جلد شانی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔"

دادی بیک وقت جمشید اور جہان دونوں سے مخاطب تھیں۔

"جی ......" جہان نے فرمانبرداری سے گردن ہلائی۔

"تو پھر نکاح کے لیے اگلا جمعہ کیسا رہے گا؟" دادی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اتنی جلدی......" وہ حیران ہوا۔

CamScanner

"دادی! آپ شانی سے اتنی عاجز آئی ہیں۔" وہ مسکرایا دادی بھی اس کی شرارت محسوس کرتی مسکرا دیں۔
شانی نے سن کر ہنگامہ مچا دیا۔ "اگر میرے امی ابو ہوتے تو کیا میرے ساتھ ایسے کرتے۔" اس نے دہائی دی تھی۔ دادی نے توجہ نہ دی، اسی طرح اطمینان سے چھالیا کترتی رہیں پھر پاندان سائیڈ میں کر کے شانی کو خود میں بھینچ لیا۔
"تو اسے میری خود غرضی سمجھ لے شانی میں چاہتی ہوں کہ تو ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے۔" شانی کا دل ایک بار پھر بھر آیا مگر اب وجہ اور تھی۔

پھر اس نے کوئی واویلا نہیں کیا تھا وہ خاموش ہوئی تھی دادی نے اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنی توجہ تیاریوں پر مرکوز کر دی۔

☆.....☆

دادی نے جو ٹرنک کے منہ کھولے تو وہ حیران رہ گئی اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی دادی نے کب اس کے لیے اتنا سامان جمع کر لیا تھا۔ محلے والوں نے بخوشی کام بانٹ لیے تھے، چھوٹے تایا دو دن قبل ہی پہنچے تھے، ان کی بیٹی کو نکاح والے دن آنا تھا۔ بڑے تایا کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ شریک بھی ہوں گے یا نہیں دادی اور شانی دونوں کو تائی کی دھمکی یاد تھی دادی جانتی تھیں کہ بڑی بہو کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔
دو دن محلے کی عورتوں نے اسے مایوں بٹھا دیا۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اس کے سر کے اوپر سے گذر رہی تھی وہ کم عمر اور نا سمجھ تھی، حقیقتاً شادی کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھی لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی۔ پھر تو یہ شادی والے دن تک معمول رہا سب شام کو جمع ہو جاتیں اور رات گئے تک گلا پھاڑ پھاڑ کے گاتیں رہتیں۔ جہان پار ان پہلے ہوٹل شفٹ ہو گیا تھا۔ اسے یہی ٹھیک لگا تھا دادی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔
جب سے اماں نے انہیں فون پر اطلاع دی تھی تب سے شمسہ نے ایاز صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا ہوا تھا۔ "اگر تم بھیجی کی شادی میں گئے تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" انہوں نے اعلان کر دیا تھا۔ ایاز نے کمزور سے لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے وہ فساد ڈالا کہ انہوں نے فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی۔ اظفر نے دادی کو شیشے میں اتارنے کے ایک سو ایک طریقے سوچ لیے تھے۔ ابھی وہ خیر پور جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شانی کی شادی کی خبر نے اس پر بجلی گرا دی وہ ماتمی صورت بنائے گھومتا اور اس کی صورت دیکھ کر شمسہ نئے سرے سے جلنے لگتیں۔
سحر باپ کو اکساتی رہی انہیں سمجھاتی رہی کہ ان کا شریک ہونا کتنا ضروری ہے اسے باپ کی بزدلی پر بھی تاؤ آ رہا تھا اور کسی کو پروا نہ تھی نہ ہی کسی کو جانے کا شوق چڑھ رہا تھا۔ جس دن شادی تھی اس دن شمسہ نے صبح سے الجھ مچا رکھی تھی باپ کی صورت دیکھ کر سحر سے برداشت نہ ہوا چپکے سے اپنی اور ابا کی تیاری کی اور لاؤنج میں نکل آئی۔
"کوئی جائے نہ جائے میں اور ابو تو جا رہے ہیں۔" ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے باپ کا ہاتھ تھام کر انہیں اٹھایا۔
"مگر....." وہ تذبذب میں مبتلا تھے۔
"چلیں ابو دادی اور شانی انتظار کر رہے ہوں گے اس نے ان کا ہاتھ کھینچا انہیں حوصلہ ہوا ساری زندگی وہ

اس عورت کی ہر بات مانتے آئے تھے اگر آج بھی مان لیتے تو ساری زندگی شرمندہ رہتے۔
''اگر تم وہاں گئے تو میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔'' وہ پیچھے سے چلائیں تھیں۔
''ٹھیک ہے، ویسے بھی کئی دن ہو گئے آپ کو نانی کے ہاں گئے ہوئے آپ کچھ دن ہو آئیں۔ سحر نے پلٹ کر جواب دیا آخر وہ ان ہی کی بیٹی تھی۔
کوچ میں بیٹھ کر اس نے باپ کو ایک طویل لیکچر دیا تھا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ انہیں خاموش رہ کر بلاوجہ امی کو خود پر حاوی نہیں کرنا چاہیے، جہاں ضرورت ہو وہاں زبان کھولی چاہیے۔
''میں خاموش رہتا ہوں کیونکہ نہیں چاہتا کہ چار گھر میرے گھر کی آواز سنیں اور اسے وہ میری کمزوری سمجھ بیٹھی ہے۔'' انہوں نے گہری سانس بھری تھی۔

☆.....☆

گھر پہنچتے ہی وہ دادی سے ملتی شانی کے پاس پہنچی تھی، لڑکیوں میں گھری شانی کو دیکھتے ہی اسے دھچکا لگا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسے عینک والا جن کی بل بتوڑی یاد آئی تھی۔ میک اپ کچھ عجیب طرز کا کیا گیا تھا آنکھوں پر لال پیلا ہرا اور نجانے کون کون سے رنگ اپنی بہار دیکھا رہے تھے گال بالکل ہی لال انگاروں کی طرح لگ رہے تھے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک تازہ لہو کے رنگ کی تھی۔
''کس..... کس نے کیا ہے یہ میک اپ۔'' اس نے دانت پیسے۔
''میں نے۔'' رفو نے دانت نکالے تھے۔
''جب آتا نہیں تو کیوں کی زحمت۔'' اس نے غصے سے اسے گھورا تھا۔
''تم تیار نہیں کر سکتی تھیں۔'' اس نے نک سک سے تیار سروش کو گھورا تھا جس نے کاندھے اچکا کر اس کے غصے کو مزید ہوا دی تھی۔
''میرا بیگ لے کر آؤ۔'' وہ غضب ناک لہجے میں رفو سے مخاطب ہوئی تھی۔
بیگ کے آتے ہی اس نے سب کو نکال باہر کیا اور اس کا حلیہ درست کرنے میں جت گئی ایک گھنٹے کی محنت کے بعد وہ اسے چندے آفتاب چندے مہتاب قسم کا شاہکار بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔
''ہاں اب خیر نہیں اس.....'' بولتے ہوئے اس نے بریک لگا دیا تھا دولہا کے بارے میں وہ کچھ بھی تو نہ جانتی تھی۔ اس کے دولہا کو دیکھنے کا جتنا اشتیاق ہو رہا تھا اسے وہ سب شانی کو چڑیل کے حلیے میں دیکھ کر بھول گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شانی پر تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ کرتی۔ دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔
دروازے پر ابو اور تایا مع مولوی صاحب موجود تھے۔ ایجاب وقبول کی منازل اس نے دونوں تایا کے جلو میں طے کی تھیں۔ دادی تو سامنے تھیں ہی نہیں۔ حالانکہ اس کی نظروں نے انہیں ڈھونڈا تھا وہ کمرے کے باہر کئی احساسات کے زیر اثر تھیں، جہاں شانی کے پرائے ہونے کا دکھ تھا وہیں اس کے قریب ہونے کی خوشی تھی انہیں اطمینان تھا کہ اپنے آخری فرض سے بھی وہ بخیر وخوبی سبکدوش ہوئیں۔ انہیں اطمینان تھا کہ اپنے بیٹے کی امانت کو انہیں نے محفوظ ہاتھوں میں سونپا ہے۔ اور وہ روز آخرت خدا کے سامنے اور اپنے بیٹے کے سامنے سرخرو ہونگی۔

☆.....☆

مردوں کے لیے باہر قناتیں لگوائی گئیں تھیں، جبکہ عورتوں کے لیے انتظام گھر میں ہی کیا گیا تھا بڑے کمرے سے فرنیچر ہٹا کر خواتین کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ نکاح ہوتے ہی سحر اسے وہاں لے آئی تھی۔

"دادی! دولہا کو بلوا نہیں۔" اس نے کہا۔
"بیٹا کھانا کھا لینے دو سب کو پھر بلوا لینا۔" دادی نے رسان سے سمجھایا تھا۔ دوپہر کا نکاح تھا جس کو ایاز صاحب کے انتظار کی وجہ سے شام ہو گئی تھی۔ عورتوں اور بچوں سب کے چہروں سے بے زاری جھلکنے لگی تھی۔
"بھائی کھانا ہوتا رہے گا آپ بلوائیں۔" اس نے ضد کی۔ مجبوراً دادی نے جگنو کو اسے لانے کے لیے کہا تھا۔
سفید کاٹن کے شلوار سوٹ میں ملبوس سادہ دولہا ان دولہوں سے ہزار گنا بہتر لگ رہا تھا جو گھنٹوں سیلون میں گزار کر نکلتے ہیں۔ گو کہ فیاض صاحب کی فیملی دو دن قبل آ چکی تھی۔ پر وہ بھی جہان کے ہوٹل شفٹ ہونے کے باعث اس سے مل نہیں پائے تھے سوائے چھوٹے تایا اور جنید کے رشک اور حسد کے ملے جلے تاثرات تھے سب کے۔
"دادی کو ایسا ماسٹر پیس کہاں سے ملا۔" سروش نے سحر کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی۔
"شانی کا نصیب ایسا ہی شاندار شخص ہونا چاہیے تھا۔" جنید اور سحر کی ایک اپنی سوچ تھی۔ اس نے دونوں کی جوڑی کو دس میں دس نمبر دیے تھے۔
کھانا لگتے ہی لوگ کھانے پر بری طرح ٹوٹ پڑے۔ بدنظمی کی ایک اعلیٰ مثال سامنے تھی۔ سحر بے چاری لمبے سفر سے آئی تھی اور آتے ہی شانی سے ملی تھی۔ اب مہمانوں میں جت گئی تھی۔ چھوٹے تایا کی فیملی تو خود کو مہمانوں کے بھی مہمان ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔
مہمانوں میں گم اسے اچانک ہی شانی کا خیال آیا، جسے وہ کچھ دیر قبل کمرے میں اکیلا چھوڑ کر آئی تھی۔ ٹرے میں کھانا لگا کر وہ اس کے پاس چلی آئی۔
وہ اس کی آہٹ سے بے خبر بیڈ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ گود میں دھرا تھا ایک ہاتھ وہ گلے میں پہنے نیکلس پر پھیر رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ گر رہے تھے۔
"کیا ہوا؟" ٹرے سائیڈ پر رکھ کر وہ نرمی سے گویا ہوئی۔ وہ چونک گئی۔
"دادی نے کہا تھا یہ میرے امی کے زیور ہیں۔" کچھ دیر بعد وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔
سحر نے اسے گلے سے لگایا تھا وہ اپنے ماں باپ کو مس کر رہی تھی یہ فطری بات تھی۔
"تم کچھ دیر آرام کر لو۔" اسے بستر پر دراز کر کے اس نے اس کی پیشانی چومی تھی۔ کھانے کے برتن سمیٹ کر باہر نکلتے ہوئے اس نے اس کے آرام کے خیال سے کنڈی لگا دی تھی۔
ابھی وہ بڑا کمرا سمیٹ کر فارغ ہوئی تھی کہ ایاز صاحب نے سر درد کی شکایت کر دی۔ وہ گھبرا گئی۔ ایاز درد شقیقہ کے مریض تھے۔ دادی سے پوچھ کر وہ ان کا بستر بچھانے چلی گئی۔ ایک پلنگ پر باپ کا بستر بچھا کر اس نے دوسرے پلنگ پر چچا کا بستر لگایا تھا۔ کچھ دیر ستانے کی نیت سے وہ بیٹھی تھی۔ آج کا دن اتنا اعصاب شکن اور تھکن بھرا تھا کہ وہ بیٹھے سے نیم دراز ہوئی اور پھر کب نیند کی آغوش میں چلی گئی اسے پتا ہی نہ چلا تھا۔

☆.....☆

جہان جس وقت گھر میں داخل ہوا۔ پورا گھر اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صحن میں ایک ٹمٹماتا بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی میں دادی جمشید کی بیگم کے ساتھ مل کر بچا ہوا کھانا ٹھکانے لگوا رہی تھیں۔ اس کا ٹائن کا سوٹ قدرے مسلا ہوا تھا، وجہ اپنی شادی میں اس نے ویٹرنگ سروس بھی کی تھی۔ ایاز صاحب سفر کرنے کے باعث اس حد تک بھاگ دوڑ نہیں کر سکے تھے۔ فیاض صاحب اور جنید نے جمشید اور ان کے بیٹوں نے بھی تھکا دیا تھا۔

(جاری ہے)

جیا قریشی

صبح نو کا سورج

digest novels lovers group

مگر کھانے پر جو ہڑ بونگ مچی تھی، اسے دیکھ کر اسے خود ہی میدان میں اترنا پڑا تھا۔ قصور لوگوں کا نہ تھا، دوپہر کے کھانے کو جب رات ہوئی تو یہی ہونا تھا۔ لوگوں کی تعداد دیکھ کر جنید کو لگا تھا، جیسے پورا خیر پور ہی شانی کی شادی میں امڈ آیا ہو، دادی کے ملنے جلنے والے ہی اس قدر تھے اور پھر سچ پوچھو تو یہی ان کا کنبہ تھا۔

جمشید کی بیگم اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ جب کہ دادی کو اسے وہاں کھڑا دیکھ کر الجھن ہو رہی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئے چلی گئیں تو وہ ان کی مدد کو آگے بڑھا تھا۔

"چھوڑو اسے، تم جاؤ۔ کب سے بلاوجہ یہیں کھڑے ہو۔" دادی کی الجھن بالآخر باہر آئی۔

"دلہن کو تو میرے حوالے کر دیں۔" وہ دل ہی دل میں منمنایا تھا۔

"ہائیں کب سے یہیں کھڑے ہو بلاوجہ میرے بھی دھیان میں نہیں رہا، میری بچی اکیلے ڈر رہی ہوگی۔" دادی چونک پڑیں۔

"عجیب شادی ہوئی ہے میری ..... دولہا بغیر دلہن ہی رخصت کر دی۔" سوچتا ہوا وہ جانے کو مڑا، دو دو سیڑھیاں پھلانگتا وہ اوپر پہنچا۔ چھت پر رکا، چال میں وقار پیدا کیا اور نپے تلے قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہوا۔

مکمل ناول

پلنگ کے گرد گلابوں کی لڑیاں تھیں، کمرے کے ایک کونے میں شانی کے جہیز کا سامان ڈھیر تھا۔ سب کچھ تھا کمرے میں بس دلہن ندارد تھی۔ کمرے کے بعد کچن، کچن کے بعد باتھ روم حتیٰ کے چھت کے کونے میں پڑے کاٹھ کباڑ بھی اس نے جائزہ لے لیا۔ دلہن اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ وہ واپس کمرے میں چلا آیا اور ایک بار پھر تفصیلی نظر دوڑائی مگر دلہن وہاں ہوتی تو نظر آتی۔ ادھر کمرے کا دروازہ کھولتے ہی دادی دھک سے رہ گئیں تھیں۔

سامنے پلنگ پر شانی محوِ خواب تھی۔

"ہائے میرے خدا۔" دادی کے دونوں ہاتھ دل کے مقام پر ٹھہر گئے۔

"شانی.....شانی اٹھ....." وہ اسے جگانے کی کوشش کرنے لگیں مگر اس کی نیند تو مردوں کو بھی مات دیتی تھی۔

انہوں نے زبردستی کھینچ کر اسے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"کیا ہوا دادی۔" دادی کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی وہ بند آنکھوں کے ساتھ بولی تھی۔

"اوپر چل شانی۔" کھینچا تانی جاری تھی۔

"کیوں.....؟" وہ دادی کی گرفت سے ہاتھ چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"اٹھ جا شانی! کیوں مجھے ذلیل کرانے پر تلی ہے، بچہ بیچارا کیا سوچ رہا ہوگا۔" وہ اس کے گال تھپتھپانے لگی تھیں۔

"کیا ہے دادی! سونے دیں ناں۔" وہ جھنجلائی۔

"اوپر چل بیٹا! جہان انتظار کر رہا ہوگا۔" انہوں نے پھر اسے بٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے کہیں نہیں جانا دادی!" وہ گہری نیند میں تھی، دادی بری طرح ہانپ گئی تھیں۔

بے حد پریشانی کے عالم میں وہ کمرے سے باہر نکلی تھیں کہ کمرے کے باہر کھڑے جہان کو دیکھ کر چونک گئیں اندر ہونے والے مکالمات یقیناً اس نے بھی سنے تھے۔

"بیٹا وہ.....وہ شانی سو گئی ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا اسے کیسے جگاؤں۔ کسی کو خیال ہی نہیں رہا۔" وہ از حد شرمندہ تھیں۔

"کوئی بات نہیں دادی! آپ بھی اسے سونے دیں اور خود بھی جا کر آرام سے سو جائیں۔" وہ نرم لہجے میں کہتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ دادی سر پکڑے وہیں کھڑی رہ گئیں۔

"کیا ہوا دادی! سر میں درد ہے۔" جنید نے ان کا شانہ ہلایا تو چونک پڑیں۔ فیاض بھی انہیں پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ دونوں باہر کا کام سارا تھکانے لگا کر آ رہے تھے۔ انہیں اس طرح راستے میں کھڑے دیکھ کر پریشان ہو گئے

"نہیں، کچھ نہیں تم جا کر سو جاؤ۔" کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے سرعت سے ادھ کھلے دروازے کو بند کیا تھا۔

"میری بچی....." شانی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے انہوں نے اس کی پیشانی چومی تھی۔

"آج کا دن یوں تو گزرنے والا نہ تھا۔ تیرے ماں باپ زندہ ہوتے تو کتنے ارمانوں سے رخصت کرتے تجھے۔" ان کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

☆.....☆

وہ ساری رات ان کی جاگتے ہوئے گزری تھی۔ صبح فجر سے بھی پہلے زبردستی شانی کو اٹھا کر انہوں نے باتھ روم میں دھکیلا تھا، جب تک وہ باہر نہ آئی وہ باہر پہرہ دیتی رہی تھیں۔

"خبردار جو تو نے کسی کو یہ بتایا کہ تو رات بھر یہیں تھی۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے آئی ہوں۔" اس کے باہر نکلتے ہی وہ بولیں۔

سب دن بھر کے تھکے ہارے دن چڑھے تک سوتے رہے۔ سورج نکل آیا تو دادی ناشتے کی تیاریوں میں لگ گئیں اور وہ کچن میں دادی کے تخت پر براجمان ہو گئی۔

''میں بنوانے والی ہوں ناں آپ کے ساتھ ناشتہ دادی، اتنے سارے لوگوں کا ناشتہ آپ کیسے بنائیں گی۔'' اس نے پھر دہرایا تھا۔

''بس جاؤ اب، نہیں کوئی ری شانی۔'' آٹا گوندھتے ہوئے دادی نے ڈپٹ دیا تھا۔

سحر پہلے ہی نہا چکی تھی۔ آنکھیں مسلتی وہ باہر آئی تو شانی کو دیکھ کر چونک گئی۔

''ارے، تم صبح صبح یہاں......!''

''صبح کہاں، بیٹا نو بج گئے ہیں۔'' دادی نے اس کی بات اچک لی تھی۔

''نہیں میں تو.......... ابھی تھوڑی دیر پہلے آئی ہوں۔'' اصل بات بتاتے بتاتے دادی کی بات یاد آ گئی تھی۔

''دادی آ رہی تھیں۔''

''جہان بھائی اٹھ گئے؟'' اس نے سوال کیا۔

''پتا نہیں!''

''سحر بیٹا ہاتھ دھو کر ادھر آ کر ذرا میری مدد کرا دینا۔'' اس سے پہلے کہ سحر کے سوال لمبے ہوتے اور وہ اپنا بھانڈا پھوڑتی دادی نے آواز دے لی۔

چھوٹی بہو کے اٹھتے ہی دادی نے انہیں بھی کام پر لگایا۔ جو کچھ رات ہوا تھا اس کے باعث انہیں جلال چڑھا ہوا تھا اور ان کا خراب موڈ سب ہی محسوس کر رہے تھے۔

''یہ اوپر لے کر جاؤ شانی۔'' سحر نے اسے ناشتے کی ٹرے پکڑائی تھی۔

''اوپر کیوں؟''

سحر نے ماتھا پیٹ لیا۔ ''شانی ڈیئر! تمہیں ہر بات سمجھانی کیوں پڑتی ہے۔''

''جہان کا ناشتہ ہے اور تمہارا بھی۔'' اس نے اسے آگے کو دھکیلا۔

''وہ نیچے آ کر ناشتہ کر لیں۔''

''نہیں وہ اوپر ہی ناشتہ کریں گے اور تم ان کے ساتھ ناشتہ کرو گی۔''

''اور تمہیں صبح بھی اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا، انہیں بغیر بتائے۔'' وہ اسے بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں تک لے آئی۔

''تو کیا میں نیچے آنے کے لیے بھی ان سے پوچھوں۔'' اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں اب جاؤ۔'' اس نے دھکا دیا۔ دو سیڑھیاں چڑھ کر وہ پلٹی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ سحر بول پڑی۔

''جاؤ ناں، سب یہیں کھڑے کھڑے ٹھنڈا کر دو گی کیا؟''

مرے مرے قدموں سے وہ اوپر پہنچ گئی تھی۔ اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی حالانکہ کوئی پہلی بار نہیں آئی تھی۔ دروازے کی جھری سے وہ اندر کا جائزہ لینے لگی۔

''یہاں کھڑے رہ کر منتر پڑھنے سے دروازہ نہیں کھل جائے گا۔'' اپنے پیچھے اس کی آواز سن کر وہ اچھل پڑی تھی۔ ٹرے میں برتن لرز گئے، شکر ہے زمین بوس نہیں ہوئے۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی اس نے بھی ایک قدم بڑھایا اور وہیں دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں ملبوس وہ دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑا بال رگڑ رہا تھا۔

"یہ دادی نے ناشتہ بھیجا ہے۔" خشک ہوتے گلے اور کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ وہ بمشکل بولی تھی۔

"جانتا ہوں کہ یہ دادی نے بھیجا ہے۔ خود سے تو آپ نے یہ زحمت کرنی نہیں تھی۔" ترچھی نظروں سے اسے دیکھتا وہ کاٹ دار لہجے میں بولا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے ٹرے سمیت اٹھا کر باہر پھینک دے۔ ایک خوبصورت رات کا جو حشر کیا تھا اس نے رات کو تو اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اٹھا کر لے آتا مگر دادی کے سامنے شرم مانع ہو گئی تھی۔

چند لمحے وہ منتظر رہی کہ وہ اس کے ہاتھ سے ٹرے لے مگر وہ تولیہ پھینک کر اب بال سنوارنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس نے بیڈ پر ٹرے رکھی اور وہیں کھڑی ہو گئی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ کھڑی ہو، مگر مجبوری تھی۔ وہ وہیں کھڑی انگلیاں مروڑتی نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ چونکی جب فضا میں مسحور کن خوشبو پھیلی۔ پلنگ پر بیٹھ کر ناشتے کی ٹرے سامنے کرتے ہوئے اس نے بھرپور نظر اس پر ڈالی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے سوٹ میں ملبوس انگلیاں مروڑتی وہ کارپٹ پر نجانے کیا کھوج رہی تھی۔

جہان کا لیے دیے ناراض سا انداز اسے حواس باختہ کر رہا تھا۔ گو کہ وہ ہمیشہ لیے دیے ہی رہتا تھا۔ کبھی ایک بار بھی اس سے تفصیلاً بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر آج اس کا یہ انداز اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد دلہن دولہا کے ساتھ اس کے گھر میں رہتی ہے جیسے گزشتہ سال رفو کی ممانی شادی کر کے اپنا گھر چھوڑ کر رفو کی نانی کے گھر آ گئی تھی۔ مگر وہ اور جہان تو پہلے ہی ایک گھر میں رہتے ہیں۔ اب وہ اوپر رہے یا نیچے کیا فرق پڑتا ہے اس کی مختصری سوچ محو پرواز تھی، جہان ناراض ہے وہ سمجھ رہی تھی مگر کیوں ہے؟ یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر تھی، حالانکہ ناراض تو اسے ہونا چاہیے تھا کہ اس نے اس سے شادی کے لیے ہاں کی تھی۔ جب کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا تھا۔

"یا تو آپ تشریف رکھیے یا تشریف لے جائیے، یوں میرے سر پر کیوں کھڑی ہیں۔" اسے مراقبے میں گم دیکھ کر وہ جھنجلا گیا تھا۔

"وہ دادی اور سحر آپی نے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ناشتہ کروں۔" وہ یوں بولی جیسے اسے مجرمانہ فعل کا مرتکب ہونے کا کہا گیا ہو۔

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے۔" وہ کڑے لہجے میں بولا۔

"میں کر لیتی ہوں۔" وہ بے چارگی کے عالم میں بولی۔ جہان کو ہنسی آ گئی جسے وہ چھپا گیا تھا۔

"یہ آپ لے لیجیے، میں فرائی انڈے نہیں کھاتا۔" اس نے پلیٹ اس کے آگے رکھی۔ چند لقمے لینے تک وہ نروس سی تھی مگر بھوک چمک اٹھی تھی، اب وہ بڑے سکون سے کھا رہی تھی۔ کھانے کے علاوہ اس کی توجہ کہیں بھی نہیں تھی جہان پر بھی نہیں جو بڑی دلچسپی سے اسے کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" سحر گرم چائے لیے حاضر تھی، بڑے پرجوش انداز میں اس نے سلام کیا تھا، جہان جواب دیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"شرم کرو شانی! سب کچھ خود ہی کھاؤ گی کیا۔" اس نے اسے شرم دلائی تھی۔

"ہاں تو میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔" چند لمحے ہاتھ روک کر اس نے جواب دیا تھا۔

"کھلایا تو تھا میں نے۔" وہ حیران ہوئی۔

"وہ تو دوپہر کا تھا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ سحر اور جہان دونوں کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی تھی۔

جہان نے ان کے لیے کرسی رکھی تھی اور وہ بیٹھ گئی۔ اب اسے تفصیلاً ملاقات کے لیے وہ کب سے بے چین

CamScanner

تھی۔ سروش بھی وہیں آ گئی تھی۔

☆☆......☆☆

ولیمے کے لیے جہان نے وہ لان بک کرایا تھا جہاں آفس کی تقریبات ہوتی تھیں۔ ولیمے کے بعد چھوٹے ماموں کی فیملی نے اجازت چاہی۔ بڑے تایا بھی آج روانہ ہو رہے تھے۔ دادی چاہتی تھیں کہ سب کچھ دن اور رک جائیں مگر سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔

وہ سب کو رخصت کر کے اندر آئیں تو شانی پلنگ پر بیٹھی بڑے مگن انداز میں زیور اتار رہی تھی۔

"چل اوپر.........." دادی نے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

"کیوں؟" اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"شادی کر دی تیری اب بھی کیا میرے سینے پر مونگ دلے گی، جہاں تیرا شوہر رہے تو بھی وہیں رہ۔"

"دادی...!" اس نے حیرانی و بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"میں آپ کے ساتھ رہوں گی دادی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آئے گی۔" اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے مگر دادی اسے کھینچتی ہوئی اوپر لے آئی تھیں۔

"یہ لو سنبھالو اپنی امانت۔" انہوں نے اس کا ہاتھ جہان کے ہاتھ میں دیا تھا، اور خود سیڑھیوں سے پلٹ گئیں۔

وہ اسے لیے کمرے میں آ گیا، آہستگی سے تھام کر اسے بیڈ پر بٹھایا تھا۔

"میں دادی کے پاس رہوں گی۔" اس کے لہجے میں کسی ضدی بچے کی سی ضد تھی۔

"ہم ان کے پاس ہی تو ہیں ایک گھر میں۔" نرمی سے کہتے ہوئے اس نے اس کے آنسو صاف کرنے چاہے تھے کہ اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"نہیں مجھے ان کے ساتھ رہنا ہے۔" وہ چیخی، جہان نے مٹھی بھینچ کر اپنے اندر اٹھنے والے ابال پر قابو پایا اور کمرے سے نکل گیا۔ کافی دیر بعد وہ کمرے میں آیا تو وہ قالین پر بیٹھی گھٹنوں میں منہ دیے سسک رہی تھی۔

وہ اس پر غصہ نہیں کر سکتا تھا، لاتعلق بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے لیے اس کے دل میں نئے نئے جذبات جنم لینے شروع ہوئے تھے اس کی دل جوئی تو اس نے کرنا تھی۔ پنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے اسے پکارا تھا۔ اس نے چہرہ اٹھایا تھا۔ وہ دہل گیا۔ پورا چہرہ اس وقت لائنر اور کاجل کی بدولت سیاہ ہو رہا تھا۔ قیمتی شرارے کے گلابی آنچل سے بلاتکلف کئی بار چہرہ صاف کیا گیا تھا۔ حال یہ تھا کہ آنسو بھی کالے ہی نکل رہے تھے، اسے دیکھتے ہی مرغی کی ایک ٹانگ کی طرح بات دہرائی گئی تھی۔

"دادی نیچے ہی تو ہیں تمہارا جب دل چاہے چلی جایا کرنا۔" اس نے نرمی سے آنسو صاف کیے۔

"ابھی دل چاہ رہا ہے۔" سرعت سے جواب دیا گیا تھا۔ اس کی معصومیت پر اسے بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔

"تم چلی جاؤ گی تو میں اکیلا کیا کروں گا۔" اس نے اسے کھڑا کیا تھا۔

"آپ تو ویسے بھی اکیلے ہی رہتے ہیں۔"

"ہم.......... پر اب نہیں رہ سکتا نا۔" اس نے اس کے گرد بازوؤں کا حصار قائم کیا تھا۔

"یہ کیا............." وہ حواس باختہ ہو گئی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

"ششش........" اس نے اس کے لبوں پر انگلی رکھی تھی۔ اس کے سینے کے پنجرے میں دل پھڑپھڑانے لگا تھا۔

پوری ہمت مجتمع کرتی وہ اس کے بازوؤں کے گھیرے سے نکلی تھی۔ دیوار سے لگی کانپتی ہوئی وہ سہمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جہان کو لمحہ بھی نہ لگا تھا حالات کو بھانپنے میں، جن خوفزدہ نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی اس سے اسے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

"سو جاؤ تم۔" بستر پر لیٹنے سے قبل وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کی آواز ہر قسم کے جذبات سے عاری تھی، وہ تب تک دیوار سے لگی کھڑی رہی تھی جب تک اسے یقین نہیں ہو گیا کہ وہ سو گیا ہے۔ اور وہ پوری رات مسلسل جاگتے ہوئے ایک ہی کروٹ پر لیٹا رہا تھا۔ رخ پھیر کر اس نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ سو گئی ہے یا نہیں۔

صبح وہ اٹھا تو وہ آدھی قالین پر اور آدھی پلنگ کے نیچے گھسی سو رہی تھی، وقت سے کافی پہلے وہ آفس کے لیے تیار ہو کر نیچے چلا آیا۔ دادی مخصوص تخت پر بیٹھی تسبیح میں مشغول تھیں۔

وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔

"آپ نے شانی کی شادی میں بہت جلدی کر دی، اسے تو شادی کا مطلب بھی نہیں پتا۔" کہہ کر وہ جانے کو مڑا تو دادی نے بوکھلا کر اسے آواز دی۔

"وہ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے دادی! اب میں ایک چھوٹی لڑکی کو اپنے ساتھ رہنے پر مجبور تو نہیں کر سکتا اور یہ صحیح بھی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رہے۔ تاوقت یہ کہ جب تک وہ بیوی کے فرائض سمجھنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔" دادی اسے آواز دیتی رہ گئیں، وہ رکا نہیں۔

"اب کیا بے وقوفی کر دی تو نے شانی۔" وہ ہول رہی تھیں۔

آفس میں سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے اس نے ہفتہ بھر کی چھٹی لی تھی مگر تیسرے دن ہی وہ آفس میں موجود تھا، جمشید صاحب نے بھی اس سے استفسار کیا تھا وہ ہنس کر ٹال گیا۔

"کیا کیا ہے تو نے شانی؟" اس کی شکل دیکھتے ہی شانی دادی نے پوچھا تھا۔

"کیا..... میں نے کیا کیا ہے؟" اس نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

"کیا کہا تو نے جہان کو؟ کوئی بدتمیزی کی تھی اس سے۔" دادی مشتعل ہونے کے ساتھ پریشان بھی تھیں۔

"بدتمیزی.....؟" وہ بھونچکا رہ گئی۔ وہ سوچتی آئی تھی کہ دادی کو اس عجیب و غریب حرکات و سکنات کیسے بتائے، ان کی تفتیش پر حیران ہی رہ گئی تھی۔ ادھر دادی سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

☆.....☆

سب ویسا ہی ہو گیا جیسا وہ چاہتی تھی، وہ دن بھر دادی کے پاس رہتی، رات کو ویسے ہی دادی سے لپٹ کر سوتی، جہان آفس سے واپسی پر نیچے ہی رک جاتا۔ جب تک وہ ہوتا وہ اس سے کترائی ہوئی پھرتی۔ دادی رات دن اسے شوہر کے حقوق و فرائض سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

جہان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود دادی نے اس کے سارے کام شانی کے سر منڈھ دیے تھے۔

اس کے کمرے کی صفائی، اس کے کپڑے دھونا پریس کرنا سب کچھ۔

"دادی! میں اس کی نوکرانی نہیں بیوی ہوں۔" شانی جھنجلا جاتی، دادی کو ہنسی آجاتی اور وہ اور جل بھن جاتی۔ جھوٹا، مکار، دھوکے باز وہ زیر لب جہان کو گالیوں سے نوازتی۔

"جہان سے پوچھو اسے کھانے میں کیا پسند ہے۔ رات کے کھانے پر وہ اپنا لیں گے۔" دادی نے آنکھیں

... ... سے پہلے روانہ کیا تھا۔
"دادی پوچھ رہی ہیں آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے، رات کو وہ ہی بنائیں گی۔" وہ پیچھے سے بولی۔
جہان کا دل جل کر خاک ہوگیا۔ ہر بات میں دادی کا لازمہ ضرور گھسائی تھی۔
"کتنے شرم کی بات ہے اس عمر میں وہ پکاتی ہیں اور تم مزے سے بیٹھ کر کھاتی ہو۔" اس نے شرم دلائی کچھ بولنے کے لیے اس کا منہ کھلا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔
"رات کو چکن بریانی بنالینا، اپنے ہاتھ سے۔" اس کا دل چاہا تھا اس کے ہاتھ کا ذائقہ چکھنے کو سو تنبیہی لہجے میں بولا۔
"او جی.........کپڑے دھو دھو کر میرے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ اب حضرت کے لیے کھانا بھی پکاؤں، وہ پاؤں پٹختی اندر آئی دادی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔
"تم کالج کب سے جوائن کر رہی ہو؟" رات کو کھانا کھاتے ہوئے وہ اس سے مخاطب تھا۔
"کالج.......؟" وہ تو کالج کو بھول ہی چکی تھی۔
"میرا موڈ نہیں ہے۔" آج کل دادی کے رویے نے اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ کر دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ جہان میں اچانک ایسے کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں جو وہ دادی کو اتنا عزیز ہوگیا۔ دادی ہر دم جہان کی رٹ لگائے رکھتیں، جہان کا یہ کر دے، وہ کر دے۔
"ہاں بیٹا! اب یہ کیا کرے گی کالج جا کر گھر گرہستی والی ہوگئی ہے۔" دادی نے بھی اس کی بات کی تائید کی۔
"نہیں دادی، کم از کم انٹر تو کلیئر کر لے.......ٹھیک ہے کالج نہیں جانا چاہ رہی تو میں پڑھا دوں گا پر انٹر کا ایگزام تو تمہیں لازمی دینا ہے۔" وہ حتمی لہجے میں کہتا کھڑا ہوگیا۔
"برتن سمیٹ کر اپنی بکس لے کر آ جاؤ۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔
وہ دیر تک انتظار کرتا رہا تھا مگر اس نے نہ جانا تھا نہ گئی۔ دادی نے کئی بار کہا بھی مگر وہ سنی ان سنی کر کے بستر پر دراز ہوگئی۔

☆......☆

ہلکی پھوار سے سارا منظر نکھر گیا تھا۔ موسم خوشگوار تھا، جہان کا دل مہک اٹھا تھا۔ آفس سے گھر جلدی لوٹنے کو اور دل کے کہے پر اس نے عمل کر ڈالا تھا۔
وہ بد ذوق موسم کی رنگینی کو بھلائے صحن میں موڑھے پر بیٹھی بچوں میں سر کھپا رہی تھی۔
"چلو بچوں چھٹی....." اس نے سب کی چھٹی کر دی۔ پیچھے وہ چیختی رہ گئی کہ کوئی چھٹی نہیں مگر بچے شور مچاتے بھاگ گئے تھے۔
"میں فریش ہو کر آتا ہوں، تم بھی تیار ہو جاؤ پھر چلتے ہیں۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔
"کہاں......؟" وہ چونک گئی
"گھومنے........" وہ جواب دینے کو مڑا۔
"دادی جائیں گی تو میں جاؤں گی۔" اس نے دادی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ خجل سا ہوگیا دادی کا تو اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ دادی مسکرا دیں، وہ بیوقوف تو نہ تھیں کہ ان کے ساتھ چل پڑتیں۔
"نہیں بھئی تم جاؤ، میری تو ہمت نہیں ہے میں کہاں خوار ہوتی پھروں گی۔" شانی کا منہ لٹک گیا۔ جہان کا جی

چاہا دادی کے لیے زور کا نعرہ لگائے۔
کچھ ہی دیر میں وہ دادی کے زبردستی کرنے کے باعث جہان ہی کا لایا ہوا گلابی رنگ کا خوبصورت سوٹ پہنے تیار تھی۔
بائیک پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے ڈھیر شرم آ رہی تھی ڈر بھی لگ رہا تھا۔
''پکڑ کر بیٹھو ورنہ گر جاؤ گی۔'' اس نے ہدایت کی۔ فوراً سے بیشتر اس نے اس کا شانہ دبوچا تھا۔
''کیا بیہودہ سواری ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔
پارک میں اس کی ساری توجہ قریب کھیلتے بچوں کے گروپ پر تھی یا قریبی کیاری میں لگے گلاب کے پھولوں پر جن پر وہ پیار بھری نظر ڈالتی، جبکہ پہلو میں بیٹھا توجہ کا منتظر شوہر جل جل کر پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔
''کچھ کھاؤ گی؟'' بالآخر جہان نے ہی چپ کی دیوار گرائی۔ جواب صرف نفی میں گردن ہلانے کی صورت میں ملا حالانکہ سامنے گول گپے دیکھ کر رال ٹپک رہی تھی، مگر جہان سے اتنی بے تکلفی تو نہ ہو پائی تھی کہ جھٹ فرمائش کر دیتی۔
''تم کالج کیوں نہیں جانا چاہتیں.....'' اس نے بات آگے بڑھائی۔
''بس یونہی.....'' اس نے شانے اچکائے۔
''تمہاری فرینڈز کیا سوچیں گی کہ شانی کے شوہر نے اس کے کالج آنے پر پابندی لگا دی۔'' وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔
''مجھے فرق نہیں پڑتا اور ان کی بات بھی مت کریں میرے سامنے۔'' وہ بھڑک گئی۔
''خیریت..... جھگڑا ہو گیا کیا تمہارا۔'' وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔
''ان کی وجہ سے تو.....'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ ان کی وجہ سے تو آپ میرے گلے پڑ گئے، مگر صحیح وقت پر زبان کو بریک لگا۔
وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''نہیں کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
''شانی! تم مجھ سے ہر بات شیئر کر سکتی ہو، ایک اچھا دوست سمجھ کر۔'' آہستگی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ شانی خاموشی سے یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔
''اب بتاؤ میری دوستی قبول ہے؟'' وہ مسکرایا۔ اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔
''تو پھر فٹافٹ بتاؤ۔''
''وہ دراصل..... وہ ان لوگوں کی باتوں میں آ کر میں نے کئی بیوقوفیاں کی ہیں۔'' وہ سر جھکائے کچھ شرمندہ لہجے میں بولی۔
''مثلاً؟'' اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
''وہ آپ کو کتنا تنگ کیا، بعد میں احساس ہوا کہ کیا کرنے لگی ہوں اور آپ کیا سوچیں گے میرے بارے میں۔'' وہ شرمسار تھی، اور جہان کے دماغ میں پڑی گرہ کھل گئی۔ وہ اس کے کترائے ہوئے رویے پر اس کی گزشتہ بے باکیاں یاد کر کے سوچ میں پڑ جاتا تھا۔

''میں نے بھی سوچا تھا کہ تم کتنی بدتمیز ہو۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا تھا۔

☆.....☆

''شانی.....!'' اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے دادی نے پکارا تھا۔

''ہوں.....'' اس نے ہنکارا بھرا۔

''تیرا دل نہیں چاہتا کہ تو جہان کے لیے سجے سنورے وہ تجھے سراہے۔'' دادی اسے ٹٹول رہی تھیں۔

''پتا نہیں دادی۔'' ان سنی کرتے اس نے کروٹ بدلی۔

''بیٹا! وہ تیرا شوہر ہے اس سے محبت کر اور اس کا خیال رکھا کر۔'' انہوں نے سمجھایا۔

''کرتی تو ہوں دادی!'' وہ بے اختیار اقرار کر گئی تھی۔ جلدی سے زبان دانتوں تلے دبائی۔

''پر اسے بتایا تو نہیں ناں۔'' دادی مسکرا دیں۔

''وہ تو میں نے آپ کو بھی کبھی نہیں بتایا کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔'' اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

''پر جتایا تو ہے ناں، تیری محبت ہر ہر انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے ہی جہان کو بھی جتانے کی ضرورت ہے، تو اس کا خیال رکھا کر بچے! اس کے دل میں اپنی جگہ بنا تا کہ اسے کہیں اور دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ شوہر ناراض ہو تو اللہ بھی ناراض ہو جاتا ہے۔'' دادی نے کہا اس کے ذہن میں کہیں اور دیکھنے کی بات اٹک گئی۔ وہ تصویر اس کے ذہن میں پوری طرح روشن ہو گئی۔ وہ بے چین ہو اٹھی تھی۔

اگلی صبح اسے دادی کی جگہ ناشتہ بناتے دیکھ کر جہان کو اچنبھا ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ سوئی ہوئی ہوتی تھی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اٹھا نہیں سکتی تھی۔ اس کے استفسار پر اس نے ان کے سونے کا بتایا تھا۔

''اب تک..... طبیعت تو ٹھیک ہیں ناں۔''

ہاں طبیعت بالکل ٹھیک ہے ان کی۔'' اسے اندر کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔

''آپ بیٹھیں، میں ناشتہ لاتی ہوں۔'' وہ سلائس سینکتے ہوئے بولی، مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی، اس کے بارے میں سوچتا وہ تخت پر ٹک گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ناشتے کی ٹرے لیے حاضر تھی۔ جب تک وہ ناشتہ کرتا رہا، وہ اس کے قریب تخت پر بیٹھی پاؤں جھلاتی رہی، ہلکی مسکراہٹ اب بھی ہونٹوں پر تھی۔ جہان نے مشکوک ہو کر اپنے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرے کہ کہیں اس کے تو ایسا کچھ نہیں لگا ہوا جسے دیکھ کر شانی بی بی کی مسکراہٹ نہیں رک رہی مگر کچھ ہوتا تو پتا چلتا۔

''شام کو کب تک آئیں گے۔'' وہ اسے دروازے تک چھوڑنے گئی اور اب خالص بیویانہ اسٹائل میں پوچھ رہی تھی۔ جہان کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ خاصے الجھے ہوئے انداز میں اس نے جواب دیا تھا۔

''کل جو دونوں کے درمیان دوستی کی فضا قائم ہوئی ہے شاید یہ اس کا ری ایکشن ہے مگر نہیں صرف یہ بات نہیں ہو سکتی.....'' وہ پورے راستے الجھتا رہا تھا مگر جو بھی تھا وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

واقعی وجہ یہ نہیں تھی، شانی اس تصویر سے خوفزدہ تھی۔ اسے ہر حال میں جہان کے دل میں جگہ بنانا تھی۔ اس نے دادی کی ہدایات پر عمل کرنے کی ٹھان لی تھی۔

☆.....☆

شام کو وہ گھر آیا اور سیدھا اوپر چلا گیا تھا، دادی نے چائے کے ساتھ اسے اوپر روانہ کر دیا۔ اسے شرم آ رہی

تھی اوپر جاتے ہوئے نگر دادی نے ڈپٹ کر بھیج دیا۔
پلنگ پر وہ اوندھا لیٹا اپنی کنپٹیاں مسل رہا تھا۔ "یہ دادی نے چائے بھیجی ہے۔" مجبح اس پر توجہ کے! نگر سے برسائے جا رہے تھے اور اب............ جہان کا دل جل کر خاک ہو گیا۔
"کہاں رکھوں؟" اس سے پوچھا گیا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ اس نے خود ہی سائیڈ میز پر ٹرے رکھ دی۔
"دادی پوچھ رہی ہیں آپ سید تھے اوپر کیوں آ گئے؟" پھر سوال کیا گیا تھا۔
"شانی میرا دماغ مت کھاؤ میرے پہلے ہی سر میں بہت درد ہے۔" وہ بھڑک گیا۔
"اچھا میں سر درد کی گولی لے آتی ہوں۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔
"لیکن وہ کچھ کھا کر کھاتے ہیں، آپ کچھ کھائیں گے۔" خیال آتے ہی اس نے پوچھا۔
"ہاں.........نیلا تھوتھا......." وہ تلملا گیا۔
"نیلا تھوتھا....." اس نے دہرایا۔
"نہیں وہ تو نہیں ہوگا۔" کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہ کیا چیز ہوتی ہے وہ بولی۔ جہان کا جی چاہا وہ اپنا سر دیوار میں دے مارے۔
"کچھ اور کھائیں گے۔" ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھا۔
"چوہے مار دوائی ہوگی۔" وہ صبر کے گھونٹ پیتا ہوا بولا۔
"چوہے مار دوائی کیوں، یہاں چوہے ہو گئے ہیں۔" چوہوں کا سوچتے ہی اس نے جلدی پلنگ پر بیٹھ کر ٹانگیں اوپر کر لی تھیں، ساتھ ہی تفتیشی نظروں سے پورے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی کراہ بلند ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔
"میں دبا دوں۔" ہمدردانہ لہجے میں پوچھا گیا اور اس کا جواب سنے بغیر ہی وہ شروع ہو گئی۔ اس کے لمس میں جادو تھا جس سے جہان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد اسے سوتا سمجھ کر وہ آہستگی سے کھڑی ہوئی۔
"شانی!" اس نے دھیرے سے پکارا تو شانی کا دل دھڑک اٹھا، پلٹ کر اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نگاہوں کا زاویہ بدلا تھا۔
"وہ الماری کھولو، ڈرا کے اندر ایک کیس ہے، وہ نکالو۔" اس نے کہا۔
"الماری کے پٹ کھولتے ہوئے اس کی نظر چائے پر پڑی۔" چائے تو ٹھنڈی ہو گئی میں گرم کر کے لاتی ہوں۔"
"نہیں، مجھے چائے کی طلب نہیں۔ تم کیس نکالو۔" وہ ڈپٹنے والے انداز میں بولا۔ دراز سے سرخ مخملی کیس نکال کر اس نے اشتیاق سے کھولا تھا۔
"یہ کس کے لیے ہے۔" کیس سے انگوٹھی نکالتے وہ اس کے قریب چلی آئی تھی۔
"اس کے لیے جو میری زندگی ہے۔" اس نے انگوٹھی اس کے ہاتھ سے اچک لی۔ اس کے دماغ میں تصویر والی لڑکی کا خیال آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کیس اس کے سر پر مارتے ہوئے نیچے کی راہ لیتی، اس نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے قریب بٹھا لیا تھا۔ انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈالتے ہوئے اس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ حیرت اور خوشی اس کے چہرے پر جگمگا رہی تھی۔
"یہ واقعی میرے لیے ہے۔" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''بالکل یہ صرف اور صرف میری چھوٹی سی خوبصورت بیوی کے لیے ہے۔'' ہولے سے اس کی لٹ کھینچتے ہوئے پہلی بار اس نے اپنا رشتہ باور کرایا تھا۔ پیلے بلب کی مدہم روشنی میں وہ اس کے عارضوں پر لرزتی اٹھتی گرتی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ، دادی انتظار کر رہی ہوں گی۔'' خود پر قابو پانے میں اسے مشکل ہو رہی تھی۔

☆......☆

بڑے تایا کو کمپنی کی طرف سے حج پر بھیجا جا رہا تھا ساتھ میں وہ ایک فرد کو بھی لے جا سکتے تھے، انہوں نے تائی کی نصیحتوں کے باوجود دادی کو لے جانے کا ارادہ کیا۔ دادی کو فون کر کے انہوں نے بتایا تو وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ ساتھ ہی جہان کو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے کاغذات تیار کرا دے۔ دادی نے جہان سے نیچے شفٹ ہو جانے کے لیے اصرار کیا تھا۔ دادی پاسپورٹ کے سلسلے میں جہان کے ساتھ جاتے ہوئے شانی کو ہدایت کر گئی تھیں کہ وہ نیچے کا کمرہ جہان کے لیے تیار کر دے۔

جہان کے کپڑوں کی جگہ پرانی الماری خالی کرتے اپنے ماں باپ کی کچھ فریم شدہ تصویریں اور پرانا البم ملا تو وہ بڑے اشتیاق سے انہیں دیکھنے بیٹھ گئی۔ البم تو اس نے کئی بار دیکھا تھا البتہ یہ تصویریں جو اس کے ماں باپ کے کمرے میں آویزاں تھیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ دادی نے کچھ تصویریں اتار کر رکھ دی تھیں، وجہ بڑی ہوتی شانی کے بے شمار سوالات تھے جو وہ ان تصویروں کو کو ہمہ وقت اپنے سامنے دیکھ کر تھی اس کی تشنگی ان تصویروں کو دیکھ کر مزید بڑھ جاتی تھی۔

کمرے کی صفائی کرنے کے بعد اس نے تصویریں بڑے کمرے کی دیوار پر لگا دیں حالانکہ تصویریں لگانے کے لیے کیل ٹھونکتے ہوئے ہتھوڑی کئی بار کیل کے بجائے انگلیوں پر پڑی تھی مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور تصویریں لگا کر دم لیا۔

دادی کے آتے ہی شانی نے بڑی خوشی سے انہیں یہ خبر سنائی تھی، انہوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا اور وضو کرنے چل دیں کہ ظہر قضا ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ البتہ جہان کو وہ بازو سے کھینچتی کمرے میں لے گئی تھیں، وہ بہت غور سے ہر تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

''کتنی خوبصورت ہے ناں میری امی اور بابا بھی.....'' اسے غور سے تصویریں دیکھتا دیکھ کر وہ اشتیاق سے بولی۔ اس کی ماں واقعی بے حد خوبصورت تھی۔ آنکھوں کا نیلا رنگ تصویروں میں بھی نمایاں تھا۔

''ہاں تم اپنے بابا پر گئی ہو۔'' وہ اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تھا۔

☆......☆

''اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس دن کی فلائٹ ہے آپ اس دن بھی تو جا سکتی تھیں۔'' بڑے تایا دادی کو لینے آئے تھے اور شانی آنسو بہاتے ان کی پیکنگ کر رہی تھی۔

''بس کر دے شانی! شادی شدہ ہو گئی ہے اب تو، بڑی ہو جا۔'' دادی مسکرا دیں تھیں۔

روانہ ہونے سے قبل انہوں نے شانی کو خوب نصیحتیں کیں تھیں اور سب کی سب جہان سے متعلق تھیں۔ اس کی ریں ریں مسلسل جاری تھی۔ جہان اسے چپ کرانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم بیٹھ کر روتی رہو۔ میں جا رہا ہوں۔'' وہ جھنجلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سرعت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"میں نہیں رو رہی اب۔" اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ جہان واپس بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں حیدرآباد لے چلوں دادی کو سی آف کرنے۔" اس نے تسلی آمیز انداز میں اس کے ہاتھ کی پشت تھپتھپائی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا شانی نے ہاتھ چھڑایا تھا نہ جہان نے چھوڑا تھا۔ انگلی میں اس کی پہنائی سونے کی رنگ تھی جہان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ شانی کی بھیگی پلکیں جھک گئیں جہان نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

☆......☆

جہان کے بہت کہنے کے باوجود شانی کالج جانے پر رضامند نہ ہوئی تو اس نے اسے خود پڑھانے کی ٹھانی شانی کو۔ اس سے بڑی شکایتیں تھیں۔ اسے پڑھاتے وقت اس کا رویہ بڑا سخت ہو جاتا تھا۔ شانی اس کے پیار بھرے رویے کی عادی ہوتی جا رہی تھی، اس کی سختی پر روہانسی ہو جاتی مگر وہ پروا نہیں کرتا تھا۔ شانی روز دادی سے فون پر اس کی شکایتیں کرتی، اپنے وعدے کے مطابق وہ اسے حیدرآباد بھی لے گیا تھا۔

عیدالاضحیٰ کے آنے میں ابھی بہت دن تھے جب وہ دو عدد حسین تگڑے بکرے لے آیا تھا۔

"ابھی تو عید آنے میں اتنے دن ہیں، ابھی سے کیوں لے آئے، اب میں گھر کے کام کروں، پڑھوں یا ان کو پالوں۔" وہ تن فن کرتی اس کے پیچھے آئی۔

"یہ تینوں کام کرو۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔" وہ روٹھی ہوئی سی پلنگ پر بیٹھی۔

"تمہیں کون سے ان کے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکانا پڑیں گے۔ یا نیو فیشن کے کپڑے سینے پڑیں گے۔ صبح شام بس گھاس ڈالنا پڑے گی اور وہ بھی تم مت ڈالنا، میں ڈال دوں گا۔"

"ہاں اور وہ جو اتنا گند کریں گے ناں وہ بھی آپ صاف کر دیجیے گا۔" وہ جل گئی۔ اسے دادی کی مرغیوں سے ہی چڑ تھی۔ جب سے دادی گئی تھیں اس نے ایک بار بھی مرغیوں کو کھلی فضا میں گھومنے پھرنے کے لیے نہیں نکالا تھا۔

"قربانی کا جانور ہے یہ۔" جہان نے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا وہ شرمندہ ہو گئی۔ دو دن تک وہ جہان کو ان کی خدمت کرتے دیکھتی رہی پھر خود بھی لگ گئی۔ اسے بکروں سے بیحد انسیت ہو گئی تھی، اس نے تو بکروں کے نام بھی رکھ دیے تھے ہیرا اور بھورا۔

"اچھا ہوا آپ انہیں لے آئے مجھے اکیلے بوریت تو نہیں ہوتی باتوں میں اچھا وقت گزر جاتا ہے۔" وہ بکروں کی ناز برداری کرتے ہوئے جہان سے مخاطب تھی۔

☆......☆

شانی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جہان اسے کہہ گیا تھا کہ وہ آفس سے جلدی آ کر چیک اپ کے لیے لے جائے گا۔ دادی کا فون آیا تو اس نے اپنی طبیعت کا بتایا تھا۔ دادی کا دل انجانی خوشی کے احساس سے دھڑک اٹھا تھا۔ اسے ہدایت کی کہ اپنے ساتھ جمشید کی بیوی کو بھی لے جائے۔ گیٹ پر دستک ہوئی تو اس نے جہان کا سوچ کر بنا پوچھے دروازہ کھول دیا۔ اپنے سامنے انجانی صورتوں کو دیکھ کر وہ سوالیہ انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی جب ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر رومال رکھا۔ چند سیکنڈ اس نے مزاحمت کی تھی اور پھر اس کا ذہن اندھیرے میں

[illegible]

جشید صاحب کی بہو یہ منظر دیکھ کر گنگ ہوئی تھی۔ ہوش آیا تو چلاتی ہوئی نیچے بھاگی، آناً فاناً سب گھر کے باہر جمع ہو گئے تھے، جہان کو فون کر دیا تھا وہ آندھی طوفان کی طرح بھیڑ کو راستے سے ہٹاتا ہوا دیوانہ وار گھر میں داخل ہوا، گھر صاف ستھرا پڑا تھا۔ صحن میں بندھے بکرے جگالی کرتے چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

وہ سر تھام کر صحن میں پڑے تخت پر گر سا گیا تھا۔

"ہمت نہ ہارو بیٹا! چلو تھانے چلتے ہیں۔" جمشید نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا پھر چونک کر بے تابانہ انداز میں اس نے موبائل نکالا۔ اس کی انگلیاں بے تابی سے کسی کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔ بیل جانے پر اس کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔ کال ریسو نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ بار بار کوشش کر رہا تھا۔

"بتاؤ تو آخر تم کسے فون کر رہے ہو؟" جمشید نے پوچھا تب ہی دوسری طرف کال مل گئی تھی۔

"اسے......اسے اغواء آپ نے کرایا ہے؟" بے تابی سے چھوٹتے ہی اس نے پوچھا، جمشید حیران، الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ دوسرے لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ دوسری طرف نجانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ بھر کر چلایا تھا۔ "آپ جانتے ہیں وہ میری بیوی ہے۔"

کال کٹ گئی تھی۔ وہ بپھرے انداز میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

"شانی کہاں ہیں جہان۔" جمشید نے بڑے سرد سے تاثر کے ساتھ پوچھا تھا۔

"میرے گھر۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولا تھا۔

"تمہارے گھر کہاں؟" وہ حیران ہو گئے۔ وہ تو اس کے بارے میں یہی جانتے تھے کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔

"میں اسے لینے جا رہا ہوں۔" وہ آگے بڑھا تھا کہ وہ راستے میں آ گئے۔

"ایسے نہیں........ بات بتاؤ ہمیں پوری۔" ان کا لہجہ مشکوک تھا دوسرے لوگ بھی اسے مشکوک نظروں سے گھور رہے تھے۔

"کہانی سنانے کا وقت نہیں ہے میرے پاس، آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل سکتے ہیں، ایسی مشکوک نظروں سے مت دیکھیں مجھے، وہ بیوی ہے میری۔" بولتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا تھا، جمشید اس کے پیچھے لپکے تھے۔

گہری غنودگی کے اثر سے باہر آتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولی تھیں۔ اطراف کا ماحول یکسر اجنبی تھا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ غنودگی اب بھی اس کے حواسوں پر طاری اسے دوبارہ اپنی آغوش میں لینے کو مضطرب تھی۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی، جونہی غنودگی کے دبیز پردے اس کی یادداشت سے سرکے۔ اسے یاد آیا اپنا گھر دادی اور..... جہان کا نام، اس کے لبوں سے بے آواز برآمد ہوا تھا۔

وہ یکدم تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ یکدم سر اٹھانے سے اس کا سر چکرا گیا تھا دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے اس نے نظر کمرے دوڑائی۔ کمرہ بے حد وسیع و عریض اور خوبصورت تھا۔ مگر اپنے گھر سے دور اور نجانے کتنی دور ہونے کا احساس اس کی آنکھوں سے سیلاب کی صورت امڈا تھا، خوف نے اس کے وجود میں سنسنی دوڑا دی تھی، وہ بنا خبر کتنی دیر بے ہوش رہی تھی، ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ یا شاید پورا دن، یہ احساس ہوتے ہی اس کے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

چکراتے سر کے باوجود اس ... نے وقت کا اندازہ لگانے کو پورے کمرے میں ایک بار پھر نگاہ دوڑائی کمرے

میں نیم تاریکی تھی۔ کھڑکیوں کے آگے دبیز پردے تھے۔ بیڈ کے دائیں طرف لکڑی کا ایک بے حد خوبصورت وال کلاک آویزاں تھا، جس پر ساڑھے تین کا وقت ہو رہا تھا، اسے یہاں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی، اس خیال نے اس کے وجود میں بجلی دوڑا دی تھی، اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔ اب کی بار وہ ڈھے گئی تھی گھڑی نجانے کتنے وقتوں سے ساڑھے تین بجا رہی تھی، بند تھی یا شاید بند کر دی گئی تھی۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلا رہے تھے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ گردن گھما کر آنے والے کو دیکھتی۔

"اسے تو ہوش آ گیا ہے؟" آواز نسوانی اور پریشان کن تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو.....؟" یہ آواز بھی نسوانی مگر نرم تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ نظر گھمائی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر بے حد خوبصورت خاتون تھیں، ان کے ایک قدم پیچھے کھڑی وہ لڑکی بھی بے حد خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چونکی نجانے لڑکی کا چہرہ شناسا سا کیوں لگا تھا۔ وہ سہمی نگاہوں سے باری باری دونوں کو گھور رہی تھی۔

خاتون بیڈ پر اس کے قریب بیٹھیں تو وہ خوفزدہ انداز میں بدک کر پیچھے ہٹی، انہوں نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے مگر پھر بھینچ لیے۔

اس کے تھکے سہمے اعصاب نے مزید اس کا بوجھ ڈھونے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ایک بار پھر بے ہوشی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ آخری آواز تھی جو اس نے دوبارہ بے ہوش ہونے سے قبل سنی تھی اس کی بند ہوتی پلکوں کے پیچھے جہان اور دادی کا عکس لہرایا تھا، ایک آنسو اس کی بند ہوتی گیلی پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر باہر نکلا اور لکیر بناتے ہوئے اس کے بالوں میں جذب ہو گیا، ان دونوں کے چہروں پر اس کے لیے ترحم اور فکرمندی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا ایک ملازمہ ہاتھ باندھے اندر داخل ہوئی تھی۔

"آغا جان کا حکم ہے، لڑکی کو ہوش آ گیا ہو تو مردان خانے میں اطلاع بھجوا دیں۔"

"جا کر کہہ دو ابھی ہوش نہیں آیا۔" وہ لڑکی بھڑک اٹھی تھی۔

"نوری! پتا کرو یہ لڑکی کون ہے؟ یہاں کس مقصد سے لائی گئی ہے..؟ اور فضل خان سے کہو کہ اسپتال جا کر ڈاکٹرنی کو لے آئے....." وہ اس پر نظر جمائے تحکم آمیز لہجے میں بولیں، نوری سر ہلاتی الٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔

"اب کیا ہوگا ام جان...." اس نے الجھن بھرے لہجے میں ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ مضطرب انداز میں اپنا نچلا ہونٹ چبا رہی تھی، پریشانی اس کے ہر ہر انداز سے عیاں تھی۔

"پتا نہیں...." آہستگی سے کہتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر اس پر نگاہیں جما دیں، اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم رہی تھیں۔ ان کے دل میں ملال بھرنے لگا، وہ ان کے لیے بالکل اجنبی تھی مگر اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ "نجانے کیوں..؟"

☆.....☆

وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ہائی وے پر تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ان کئی گھنٹوں میں جمشید نے اس سے ان گنت سوالات پوچھے تھے مگر جواب میں اس نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں میں آپ کی نظر میں مشکوک ہو چکا ہوں۔" اس نے شاید تھک کر اپنی خاموشی توڑی تھی۔ چہرے پر زخمی سا تاثر تھا۔ جمشید نے گردن موڑ لی۔ ان کا دل کٹ رہا تھا۔ دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے مشکوک قرار دیں مگر موجودہ حالات نے عقل ماؤف کر دی تھی۔ وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے اسے جانتے تھے اور ان گزشتہ کئی گھنٹوں میں وہ اس ڈیڑھ سال کا اپنے دل ہی دل میں احتساب کر چکے تھے، جس میں کوئی ایک پل بھی ایسا نہیں تھا جسے گرفت میں لے کر وہ اسے مشکوک قرار دیتے، وہ صبر سے اس کے بولنے کے منتظر تھے۔

"میرا تعلق قبائلی خاندان سے ہے۔ بنوں کے گردونواح کا کافی بڑا علاقہ میرے خاندان کی ملکیت ہے۔ آپ نے قبائلی لوگوں کی نسل در نسل چلنے والی دشمنیوں کے متعلق تو سن رکھا ہوگا، ایسی ہی ایک دشمنی کے سبب میں سات سال سے مفرور ہوں...... مجھے لگا سات سال ایک بڑا عرصہ ہوتا ہے میرے خاندان نے میری تلاش ترک کر دی ہوگی مگر........" اس کے لبوں سے تھکی سی سانس خارج ہوئی۔ اس کے اعصاب چٹخ رہے تھے جواب دے رہے تھے۔ گاڑی سڑک کنارے کھڑی کر کے اس نے اسٹیئرنگ پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

"جب مجھے بہرام چچا کے قتل کی اطلاع ملی میں اسٹین فورڈ میں تھا۔ زمین کے ایک ٹکڑے پر جاری خاندانی جنگ نے ان کی جان لے لی تھی، میں واپس پہنچا تو آغا جان کا حکم میرا منتظر تھا، مجھے بہرام چچا کا بدلہ لینا تھا قصاص میں آنے والی لڑکی سے شادی کرنا تھی، میں ان روایات سے بیزار تھا۔ ان رسم و رواج نے سالوں پہلے میری عزیز از جان ہستی مجھ سے چھین لی تھی مگر اس کے باوجود میں شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ سوچا تھا شادی کے بعد اس لڑکی پر زندگی تنگ نہیں ہونے دوں گا۔ اسے وہی عزت و احترام دوں گا، جو اس کا حق ہے،

میں ان رسومات کو ختم نہیں کر سکتا مگر اس میں بہتری تو لا سکتا ہوں، جب ہی ظلم ہوا کہ میرے نکاح میں دی جانے والی لڑکی کی عمر محض دس سال ہے۔ دس سال کی ایک چھوٹی معصوم لڑکی پر میں یہ ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے آغا جان سے دو ٹوک بات کی، ان کے لیے میرا موقف فضول تھا، اس لڑکی کو کون سا واقعی میری بیوی بننا تھا، اسے تو حویلی میں غلامی کے لیے آنا تھا اور حویلی والوں کے ظلم سہتے سہتے مر جانا تھا۔

جب میں کسی کو بھی اپنا موقف سمجھا نہیں پایا تو میں نے بہت خاموشی سے حویلی چھوڑ دی۔ ایسے چوروں کی طرح حویلی چھوڑ جانا میری مردانگی کو بھی گوارا نہ تھا۔ میں حویلی کا بڑا فرزند تھا وہاں میری ماں تھی میری عزیز از جان چھوٹی بہن تھی۔ میرا پورا خاندان تھا۔ اپنے خاندان کی سبکی بھی مجھے گوارا نہیں تھی مگر ان سب کے مقابل ایک دس سالہ معصوم بچی تھی۔ میں کسی طور بھی ایک معصوم کو ان رسوم کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا جن کی بھینٹ میری عزیز اور دوستوں جیسی پھپھو چڑھی تھیں۔ ان کا لہولہان وجود آج بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔" اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں، وہ بولتے بولتے جیسے تھک گیا تھا۔ جمشید دم سادھے اس کی داستان حیات سن رہے تھے۔ اس نے نڈھال سے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھی۔

"میں واپس امریکہ چلا گیا، لاسٹ سمسٹر تھا تین سال وہاں جاب کی۔ یہاں سے جاب آفر ہوئی تو واپس آ گیا۔ کچھ مہینوں بعد میں اپنا ٹرانسفر کرا لیا کرتا تھا کیونکہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ تک پہنچیں پھر میرا ٹرانسفر یہاں ہو گیا اور در در کی خاک چھانتا میں تھک گیا۔

ایک گھر بنانے کی خواہش شدت سے میرے اندر سر اٹھانے لگی تھی، ان ہی دنوں آپ نے شانی کا پرپوزل سامنے رکھا، تو میں نے دل کی خواہش پر لبیک کہہ دیا میں خوش تھا، مگن تھا اور انہوں نے میری خوشی مجھ

سے چھین لی، جانتے ہیں میں اس کے تعاقب میں ضرور آؤں گا۔"

گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی، ایک نظر جمشید کو دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھے، ان سے شیئر کر کے وہ کچھ پرسکون ہو گیا تھا۔ انتشار کی سی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ اس نے پوری توجہ راستے پر مرکوز کر دی۔ اسے جلد سے جلد حویلی پہنچنا تھا۔

آہنی پھاٹک کو عبور کرتے، بجری کی روش پر سے گاڑی گزارتے ہوئے اس نے رہائشی عمارت سے کچھ دور گاڑی روکی تھی، اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے وہ جامد بیٹھا تھا، سات سال بعد گھر لوٹنے کی خوشی اس کے چہرے پر نہیں نہیں تھی جس طرح وہ یہاں بلایا گیا تھا، ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے تاثرات سرد اور سپاٹ تھے۔ جمشید بغور اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ گیٹ پر موجود اسلحہ بردار گارڈ نما چوکیدار اس کی گاڑی کے پیچھے آئے تھے۔ ایک نے آگے بڑھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ چونکا۔

باہر نکلتے تیز قدموں سے آگے بڑھتے اس نے اپنی راہ میں حائل ہوتے چوکیدار کو ایک جانب دھکیلا تھا، جمشید تیزی سے اس کے پیچھے لپکے۔ کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نپے تلے قدم اٹھاتا وہ مردان خانے کی طرف بڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا علاقے میں اس کے داخلے کے ساتھ ہی اس کی آمد کی اطلاع یہاں پہنچا دی گئی ہو گی اور وہ سب باجماعت اس کے منتظر ہوں گے۔

چوبی دروازہ دھکیلتا وہ اس وسیع و عریض اور پرشکوہ ہال نما کمرے میں داخل ہوا تھا، سفید سنگ مرمر کے فرش پر اس کے جوتوں سے دھمک پیدا ہو رہی تھی، دائیں بائیں دیکھے بغیر وہ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز باریش بزرگ کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ دائیں طرف صوفوں پر تین نفوس میں سے ایک اس کا باپ تھا، سلطان خان آفریدی اور دو چچا اعظم اور حاکم۔

"جہان لالہ..." بائیں طرف سے اٹھ کر سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا مسرت سے اس کے گلے لگا تھا، یہ شاہ میر تھا، بہرام کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا۔ وہ جب یہاں سے گیا تھا تو وہ کافی چھوٹا تھا مگر پھر بھی وہ پہلی نظر میں ہی اسے پہچان گیا تھا بلکہ اس کے پیچھے کھڑے بقایا دو کو بھی، وہ دونوں حاکم کے بیٹے تھے۔ سادان اور ارسلان، ارسلان تو اس سے دو ہی برس چھوٹا تھا اور بچپن میں اس کی کافی دوستی ہوا کرتی تھی پھر بڑے ہوتے اس نے جہان کو شاید حریف مان لیا تھا، سو ان کے تعلقات بچپن جیسے خوشگوار نہ رہے تھے مگر اب وہ اس سے خوشدلی سے ملا تھا۔ اعظم کی تین بیٹیاں تھیں بیٹا کوئی نہ تھا سو اس نسبت وہ بھائیوں سے ذرا کمزور تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی نہ ہی اس نے کزنز سے ملنے میں کوئی گرم جوشی دکھائی تھی۔

"میری بیوی کو اس طرح اغوا کرانے کا سبب؟" وہ بنا کسی تکلف اور آداب کے آغا جان سے مخاطب تھا۔ لہجہ خاصا تلخی لیے ہوئے تھا۔ وہاں موجود نفوس کا سکون اور اطمینان اسے مزید سلگانے کا سبب بن رہا تھا۔

"سبب تم خوب جانتے ہو جہان خان..!، تمہارے جرائم کی فہرست کم نہ تھی کہ تم نے اس میں ایک اور اضافہ کیا ہے۔" جواب میں اس کے باپ کی آواز گونجی تھی، صورتحال کا جائزہ لیتے جمشید کو کمرے میں موجود نفوس کے چہرے پر پھیلی سنگینی ہولا رہی تھی۔ انہیں ڈر تھا کہ اس خاندانی تنازعے کی بھینٹ وہ نہ چڑھ جائیں، اب تک تو کسی نے ان کے بابت پوچھنا تو درکنار نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

"تو میرے جرائم کا حساب مجھ سے بے باق کرنا تھا، میری بیوی کو درمیان میں کیوں لایا گیا ہے.....؟"

ایک قدم آگے بڑھاتا وہ اپنے باپ کے عین سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تمہیں کیا لگا تھا جہان...! تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو، اپنے قبیلے کی روایات کو اپنے پاؤں تلے روند کے تم اپنی الگ دنیا بنا کر چین وسکون کی بانسری بجاؤ گے اور تمہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ تم بھول گئے تھے کہ ہم اپنے مجرموں کا پیچھا قبر تک کرتے ہیں۔"

حاکم نے شدت غیظ سے اس کا کالر پکڑ کر کھینچا تھا۔

"کیا آفریدی قبیلہ اتنا کمزور ہو چکا ہے آغا جان کہ عورتوں کو مہرہ بنانے لگا ہے؟" ایک جھٹکے میں کالر چھڑا تا وہ آغا جان کے سامنے آ کھڑا ہوا، انداز استہزائیہ تھا۔

"ہمیں اس کے لیے مجبور تم نے کیا ہے جہان۔" ہمارے مسلسل بلانے کو نظر انداز نہ کرتے تو ہمیں یہ قدم نہ اٹھانا پڑتا۔" نہایت پرسکون انداز میں کہتے ہوئے وہ اس کے مقابل کھڑے ہوئے تھے جہان دانت بھینچے ضبط کے کڑے مرحل طے کر رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے جہان...! تمہیں حویلی واپس کھینچ لانا ہمارے لیے مشکل تھا۔ نہیں...... کبھی نہیں، تمہیں کیوں

بھول گیا جہان کہ ہمارے ہاتھ کس قدر لمبے ہیں۔ تمہارے ٹرانسفر کی خبر تم سے پہلے ہم تک پہنچی تھی مگر ہم تمہیں ڈھیل دیتے رہے کہ کبھی تو تم اس چوہے بلی کے کھیل سے اکتاؤ گے اور خود واپس آ ؤ گے.... مگر اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، تم نے نے شاید طے کر لیا ہے کہ تم نے ہمیشہ ہمارا سر جھکانا ہے مگر اب بس........ ہمارے صبر کی حد ختم ہو چکی، جو غلطی تم نے کی ہے اسے سدھارو گے بھی تم، اس نیچ خاندان کی لڑکی کو طلاق دے کر۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا جہان خان مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں سجا کرتا۔ ہمارے گھر کا کتا بھی حسب نسب والا ہوتا ہے، وہ تمہاری اولاد پیدا کرنے والی ہے۔ لڑکا یا لڑکی ہمارا خون ہوگا، لے کر اسے چلتا کرو۔" کروفر سے بولتے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔

"آپ نے ٹھیک کیا آغا خان! مخمل میں ٹاٹ نہیں سجا کرتا۔ تو پھر اپنے مخمل میں ٹاٹ آپ نے کیوں سجنے دیا۔" وہ بلند آواز میں بولا تھا۔ آغا جان کے بڑھتے قدم رکے تھے۔

"آپ نے بجا فرمایا آغا جان! ہمارے گھر کا کتا بھی حسب نسب والا ہوتا ہے، تو پھر مجھے یہ بتائیے کہ یوسف جیسے کم نسب سے آپ نے اپنی بیٹی رومیصہ خان آفریدی کی شادی کیونکر ہونے دی تھی۔" وہ ایک بار پھر ان کے سامنے کھڑا جرح کر رہا تھا۔

"ہاں.... آپ لوگوں کی نظروں میں تو وہ بہت پہلے ہی مر چکی تھیں، آخر آپ چاروں بھائیوں نے کوئی کسر تو نہ چھوڑی تھی مارنے میں،........ مگر ذرا آغا جان کا چہرہ دیکھیں، بابا جان میری بات کا یقین آ جائے گا۔" ان کا چہرہ متزلزل تھا۔ سلطان خان کی بے یقین نظریں باپ کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ صرف وہی نہیں کمرے میں موجود نفوس کی نظریں بھی ان ہی پر تھیں۔

"میری بیوی شانزے بھی رومیصہ خان آفریدی کی بیٹی اور آپ کی نواسی ہے آغا جان! کیا اب بھی آپ یہ نہیں کہیں گے کہ میں نے مخمل میں ٹاٹ لگایا ہے؟ لہٰذا اب بھی آپ چاہیں گے کہ میں آپ کی نواسی کو طلاق دے دوں....؟ نہیں آغا جان آپ بے حد مظلوم بیٹی کی بیٹی پر یہ ظلم نہیں کرنا چاہیں گے، جس بیٹی کی قبر پر جا کر آپ اپنے اور اپنے بیٹوں کے روا رکھے مظالم کی معافی مانگتے ہیں، اس کی بیٹی پر یہ ظلم آپ یقیناً نہیں کرنا چاہیں گے۔" جہان کا لہجہ [illegible]

CamScanner

کمرے کے وسط میں رکھی راکنگ چیئر پر موجود شکستہ وجود خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا، اس کے چہرے پر اس وقت کئی تاثر کرب دکھ اور شرمندگی کے تھے جس میں سب سے نمایاں تاثر شرمندگی کا تھا۔ وہ لڑکی اگر رومیصہ کی بیٹی تھی تو لعنت تھی ان پر جنہوں نے اپنے گھر کی عزت، اپنی بیٹی کی عزت کو یوں اپنے حواریوں کے ہاتھوں اغوا کروایا تھا۔

ان کے جرائم میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک اور چیز کے لیے رومیصہ کے آگے شرمندہ تھی۔

رومیصہ ان کی اکلوتی بیٹی، چار بھائیوں کی اکلوتی بہن جو اکلوتی تو ضرور تھی، مگر عزیز از جان ہرگز نہ تھی۔ چار بیٹوں کے بعد پیدا ہونے والی رومیصہ ان باپ بیٹوں کے لیے قطعی غیر اہم تھی، مگر رومیصہ..... اس کی جان پڑی تھی اپنے بھائیوں میں وہ دیوانی تھی اپنے باپ کی، بھائیوں کی مگر بھائیوں کے کمرے میں داخلے کی اسے اجازت تک نہ تھی۔ اور آغا کریم جہاں اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہ کر سکتے تھے، وہاں بیٹی کی انہیں کوئی فکر ہی نہ تھی اور رہیں ماں جی تو انہیں حویلی کے انتظامات سنبھالنے سے فرصت نہ تھی۔

انہوں نے جب سلطان خان کی شادی کی وہ محض پانچ برس کی تھی، شاداب کو وہ ننھی اور معصوم گڑیا بہت پسند آئی تھی اور بہت جلد دونوں نند بھاوج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئیں۔ تین سال کے بعد جب جہان خان ان کی گود میں آیا تو رومیصہ بھی کچھ سمجھ دار ہو چکی تھی۔ اس کے باپ بھائی وہ مرکز تھے جس کے گرد وہ چکر کاٹا کرتی تھی۔ باپ بھائی کھانا کھاتے تو وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح چکراتی رہتی کہ جانے کب کسی چیز کی انہیں ضرورت پڑ جائے۔ آغا جی کا قہر جب ان بھائیوں پر نازل ہوتا، تو اس کی دوا بھی وہی ننھی باوجود اس کے بھائی اپنا غصہ اور جھنجھلاہٹ اکثر اس پر نکالتے وہ اگلی بار پھر حاضر ہوتی۔

آغا جان کے قدم زمین پر رکھنے سے پہلے وہ ان کے جوتے پیروں تلے رکھتی، چاہے وہ کبھی جواب دیتے یا کبھی اسے ٹوک دیتے۔ وہ آغا جان سے مسلسل کچھ نہ کچھ بولتی رہتی۔ اپنے اسکول کے قصے سہیلیوں کی باتیں کچھ نہ کچھ اسے یہ سناتی ہوتی۔ آغا جان جواب بھلے نہ دیں سن تو رہے ہیں۔ وہ اکثر چپکے سے ان کے کمرے میں چلی آتی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے کبھی ان کا سر دباتی کبھی پاؤں، اپنی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشیں بیان کرتی جو کبھی پوری ہی نہ ہوتیں۔

یوں وہ بڑی ہوتی گئی۔ آٹھویں کے بعد اس نے آغا جان سے ضد کر کے نویں کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ بھائی اس کے حق میں نہیں تھے مگر پہلی بار آغا کریم نے بیٹی کی کوئی بات مانی۔ دسویں کے بعد اس نے چاہا کہ انٹر کے ایگزام کی تیاری پرائیویٹ کرے مگر آغا جان نے اسے خاموش کرا دیا۔ وہ اب اس کی شادی کرنا چاہتے تھے۔

بہرام خان کے ہاتھوں مخالف قبیلے کے دو ملازمین قتل ہوئے تھے، آفریدی قبیلے اور آغا جان کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ دیت کی رقم ادا کر دی جاتی یا مخالف قبیلے کو لڑکی دی جاتی، مگر وہ لڑکی رومیصہ خان آفریدی ہو گی یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ مخالف قبیلے نے جرگہ کے ذریعے جو شرط عائد کی تھی، اس نے آفریدی قبیلے کو کاری ضرب لگا دی تھی ورنہ دوسری صورت میں ان کا مطالبہ بہرام خان تھا۔

ہمیشہ کی غیر اہم رومیصہ اچانک بھائیوں کے نزدیک اہم ہو گئی تھی اور جب اسے پتا چلا کہ اسے بہرام خان پر قربان ہونا ہے تو وہ بپھر گئی، آغا کریم کو آج بھی اس کے الفاظ یاد تھے۔

"میں ہمیشہ آپ لوگوں کی ایک نگاہ کے لیے ترستی رہی بابا جان،" وہ واحد فرد تھی جو انہیں آغا جان کے بجائے

باباجان کہا کرتی تھی۔" اور آج میں اپنے بھائیوں کو یاد بھی آئی تو اپنے مطلب کے لیے، بہنیں بھائیوں پر قربان ہو ہی جایا کرتی ہیں میں بھی ہو جاتی اگر مجھے میرے بھائیوں نے کوئی مان بخشا ہوتا، مگر اب نہیں آغاجان بہرام لالہ سے کہیں مردوں کی طرح سامنے سے اپنا کیا بھگتیں، میں ان پر قربان نہیں ہوں گی۔" اس کا چٹانی لہجہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ ان ہی کا خون تھی۔

سلطان خان کے دباؤ ڈالنے پر اس نے کہا تھا کہ وہ کشمالہ کو پیش کیوں نہیں کر دیتے اور سلطان خان کے طمانچے نے ان کا منہ گھما دیا تھا۔ وہ آغاجان کو دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی اور وہ نگاہ چرا گئے تھے۔

ماں کے سمجھانے پر وہ بہت دیر زخمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی تھی پھر بولی تو بس اتنا "اماں! مجھے لگا تھا کہ آپ بس صرف آپ میرے قربان ہونے کے حق میں نہ ہوں گی مگر آپ کو بھی صرف بیٹا عزیز ہے۔"

بہرام خان نے رومیصہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے اسے مردان خانے طلب کیا تھا۔ وہ ضدی تو نہ تھی پر نہ جانے کیوں اتنی ضدی ہو گئی تھی۔، اس کی ضد نے بہرام خان کو غصے سے پاگل کر دیا تھا۔ وہ اس پر پل پڑا تھا اور بجائے اسے روکنے کے ان تینوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

آغا کریم کو جب تک علم ہوا، وہ چاروں اس کے نیم مردہ وجود کو مردہ سمجھ کے اس کی تدفین کا انتظام کرنے جا چکے تھے۔ اپنی بیٹی کے نیم مردہ وجود کو اٹھاتے ان کے ہاتھ کپکپا گئے تھے، مگر بولے تو لہجہ سپاٹ ہی تھا "محمود خان اسے لے جاؤ اور بہ حفاظت کسی محفوظ مقام پر منتقل کرو۔ اپنے بعد میں صرف تم پر بھروسا کرتا ہوں۔" ان کا لہجہ سخت تنبیہی آمیز تھا۔ محمد خان ان کا پرانا اور وفادار ملازم تھا۔ ان کے ساتھ کھیلا تھا، مگر قسمت کا کھیل تھا وہ شاہ تھے اور وہ ان کا ملازم۔ ان کے ہاتھوں سے اس نازک وجود کو تھامتے وہ حویلی کے پچھلے گیٹ سے نکل گیا، وہ ان کے ہاتھوں میں کھیلی تھی انہیں خان چاچا بلایا کرتی تھی، اسے کہیں جانا ہوتا ڈرائیور کے ہمراہ وہ اس کے ساتھ ضرور جایا کرتا تھا اور راستے بھر وہ بلا تکان بولا کرتی تھی۔

وہ علاقے کی حدود سے باہر نکل آیا تھا، راستہ کچا اور اندھیرا تھا وہ کئی بار رومیصہ کے زخمی وجود کو کاندھے سے اتار کر اس کی چلتی سانسوں کا اطمینان کرتا اور پھر چلنے لگتا، ایسے ہی اس نے کاندھے سے اتارا تھا کہ موڑ کاٹتی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی تھیں، وہ یکدم ہی گھبرا گیا، دو قدم پیچھے ہٹتے وہ درخت کی اوٹ میں ہو گیا تھا، گاڑی اس کے سامنے سے گزری تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ کوئی پرانی اور چھوٹی سی گاڑی تھی، اس علاقے کے خود ساختہ خداؤں کی گاڑی نہ تھی اور اس سے پہلے کہ وہ رومیصہ کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا، گاڑی ریورس ہوئی اور رومیصہ کے قریب رکی، اس میں سے ایک لڑکا تیزی سے باہر نکلا۔ رومیصہ کے وجود کو سیدھا کرتے اس نے اپنی ماں کو پکارا تھا۔ گاڑی میں سے سفید چادر اوڑھے عورت برآمد ہوئی تھی، کچھ پل وہ دونوں اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرتے رہے پھر لڑکا جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار اپنی ماں سے چلنے کا کہہ رہا تھا، مگر خاتون اسے چھوڑ کر جانے کو راضی نہ تھیں اور چند قدم دور کھڑا محمد خان دعا کر رہا تھا کہ وہ لوگ چلے جائیں۔ مجبوری تھی وہ ان کے سامنے جا بھی نہیں سکتا تھا، رومیصہ کی جو حالت تھی، اس کی حیثیت مشکوک ہو جاتی، بالآخر ماں کے مجبور کرنے پر لڑکے نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ اماں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی اور محمد خان ہاتھ ملتا رہ گیا۔

... نے مطمئن کر دیا تھا، رومیصہ کے قتل کو حادثاتی موت کا نام دیا

اور اس کی جھوٹی تدفین بھی ہوگئی، مخالفوں نے اس کی موت کو حادثاتی ماننے سے انکار کر دیا اور جرگہ بٹھا دیا، آغا کریم نے بیٹوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ رومیصہ کی جو حالت تھی اس نے انہیں مجبور کر دیا کہ اس کی فوری تدفین کی جائے ورنہ میت کو دیکھ کر لوگوں کا شک یقین میں بدل جاتا، جرگہ بیٹھنے سے بیٹوں کی توجہ ہٹ گئی اور وہ سچ جھوٹ کی تحقیق میں نہ پڑے۔

آغا کریم کو محمد خان نے مطمئن کر دیا تھا مگر خود وہ بے چین تھا گو کہ وہ ماں بیٹا اسے شریف لگے تھے مگر کسی کا کیا بھروسہ...... چار ماہ لگے تھے محمد خان کو رومیصہ کو ڈھونڈنے میں اور بالآخر خیر پور میں اس کی موجودگی کا پتہ چلا، مگر رومیصہ خان آفریدی کی حیثیت سے نہیں رومیصہ یوسف کی حیثیت سے۔ محمد خان واپس چلا آیا اور آغا کریم کو رومیصہ کے بارے میں اطلاع دی، آغا جان نے اس سے کرید کرید کے یوسف اور اس کے گھر والوں کے بارے میں سوال کیے تھے عام حالات میں وہ اس جیسے خاندان میں اور اپنے قبیلے سے باہر بیٹی کی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اب کم از کم اس بات پر شکر گزار تھے کہ ان کی بیٹی عزت سے کسی کی عزت بنی تھی۔

جہاں آرا بیگم کی زبانی رومیصہ کو بس اتنا علم ہوا تھا کہ وہ انہیں اور یوسف کو راستے میں زخمی حالت میں ملی تھی، جب وہ یوسف کے دوست کی شادی میں شرکت کر کے واپس آ رہے تھے اور وہ اپنے گھر والوں کے لیے چار سال تک دل میں شدید نفرت لیے زندہ رہی تھی جنہوں نے اسے مار کر راستے میں پھینک دیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے محمد خان کے ذریعے محفوظ رکھنا چاہا تھا یا اس کا باپ اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے وہ انجان تھی اور اسے انجان ہی رہنا تھا۔

یوسف اور اس کے کار حادثے میں ہلاک ہو جانے کی خبر آغا جان پر بجلی بن کر گری تھی۔ انہوں نے اس کا جنازہ پڑھا اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا مگر کسی کو ان کا رشتہ معلوم نہ تھا، نہ ہو سکا۔ اسے دفنانے کے بعد وہ پہلی بار محمد خان کے کاندھے پر سر رکھ کر بری طرح روئے۔ جو احساس جرم اس کی خوش و خرم زندگی کے بارے میں سن کر دب گیا تھا، بری طرح ابھر گیا، وہ اس کی قبر پر جاتے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، رومیصہ کی برسی والا دن ان پر بھاری گزرتا، ایسے ہی ایک دن انہیں اتنا رنج و ملول دیکھ کر جہان خان کے استفسار پر محمد خان نے رازداری کا وعدہ لے کر اسے اس راز میں شامل کر لیا، جو برسوں سے اس کے دل میں دبا تھا، اور جہان خان یہ راز دل میں دبائے امریکہ چلا گیا۔

شانزے سے شادی تک وہ حقیقت سے لاعلم ہی تھا۔ وہ تو شانزے جب اسے کھینچ کر لے گئی تھی اور اپنے ماں باپ ماں باپ کی ایک ایک تصویر اسے دکھائی تو وہ چونکا تھا۔ آٹھ سال کوئی اتنی چھوٹی عمر نہیں ہوتی اسے اپنی رومی پھپھو بہت اچھی طرح یاد تھی اور اس پر ہوا ظلم بھی۔

اسے کبھی نہ کبھی شانزے کو اس کی ماں کے بارے میں بتانا تھا مگر وہ ایسے اور ان حالات میں بتائے گا، ایسا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اسے اتنی بڑی خوشخبری آغا جان کے منہ سے اس طرح سننے کو ملے گی، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور شانزے وہ اب تک تو انجان تھی۔ جہان نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ بے یقین نظریں جہان پر جمی تھیں۔ وہ ساکت تھی وہ دادی سے کرید کرید کر اپنی ماں کے بارے میں پوچھا کرتی تھی، اس کا ننھیال کیوں نہیں ہے؟ اس کا کوئی بہن بھائی کیوں نہیں ہے؟ اسے خدا سے بہت شکوے رہا کرتے تھے، مگر اس کی ماں کی کہانی اتنی دردناک ہوگی اس کا ننھیال اتنا ظالم ہوگا یہ تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ تو ایسے ہوا کرتے ہیں بھائی؟ جن کے لیے اسے خدا سے شکوہ ہوا رہا تھا۔

جہان نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ تھامتے اس کے آنسو صاف کیے۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگایا۔ وہ بلک پڑی تھی اور وہ اسے ہولے ہولے تھپک رہا تھا، وہ شاید سال بھر کی ہوگی جب اس کی ماں اس سے جدا ہوئی۔ اپنی ماں کو اس نے تصویروں میں دیکھا تھا، اسے تو اس کی آغوش کی گرمی بھی یاد نہیں تھی مگر اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ماں آج مری ہے۔

دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی تھی۔ شانزے نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہی خاتون اور لڑکی داخل ہوئیں جنہیں دیکھ کر وہ بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"یہ میری ماں ہیں شانزے اور یہ کشمالہ میری بہن۔" اس نے تعارف کرایا اور شانزے کو یاد آیا کہ تصویر میں جس لڑکی کے شانوں پر جہان کا بازو دراز تھا، وہ یہی لڑکی تھی۔

"ماشاءاللہ..! میری بہو لاکھوں میں ایک ہے۔" میری رومی کی شانی، کبھی سوچا بھی نہ تھا اس کی شانی ایک دن یوں اس روپ میں نظروں کے سامنے ہوں گی ہم تو اسے رو ہی چکے تھے۔" نم آنکھوں سے انہوں نے اس کی پیشانی چومی تھی۔

☆.....☆

کئی پہر گزر چکے تھے انہیں یوں بیٹھے، وہ مجرم تھے، برابر کے شریک تھے۔ اپنے بیٹوں کے ظلم میں۔ رومیصہ ان کی اولاد اس کے لیے قدرتی طور پر دل میں نرم گوشہ تھا مگر وہ نرم گوشہ دب گیا تھا۔ بیٹے آن تھے، شان تھے، طاقت کا مظہر تھے۔ وہ کیسے ایک بیٹے کو دشمنوں کے حوالے کر دیتے اور رہ گئی رومیصہ تو عورتیں تو ازل سے مردوں کے کیے کا تاوان بھرتی آئی ہیں مگر ہائے..... یہ ضمیر کی کسک چین نہیں لینے دیتی۔ وہ بھی کئی برس سے ضمیر کی عدالت میں مجرم بنے کھڑے تھے..... شاید آج اس بوجھ میں کمی واقع ہو جائے۔ رومیصہ نام کی پھانس ہمیشہ دل میں چبھتی رہتی تھی مگر شاید اس چبھن میں کمی واقع ہو جائے، اس سوچ نے انہیں اٹھنے پر مجبور کیا تھا اور کچھ لمحوں بعد وہ شانزے کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

بوڑھی آنکھوں میں نمی تھی اور آنکھیں التجائی انداز میں اس کی طرف اٹھی تھیں اور شانزے کے دل کی جگہ کوئی پتھر تو فٹ تھا نہیں، جو نہ پگھلتا۔ یہ بوڑھا وجود تو شرمساری کے عمیق سمندر میں ڈوبا ہوا تھا، اس سے اس کی ماں نے کبھی بے حد محبت کی تھی وہ اس کی ماں کا باپ تھا خون کی کشش نے ایک دوسرے کو کھینچا تھا اور وہ سب بھول کر ان کے سینے سے جا لگی۔ وہ دونوں بلک بلک کر رو رہے تھے اور وہ اس سے معافی طلب کر رہے تھے رومیصہ کی بیٹی سے، رومیصہ پر ہوئے ظلم کی معافی، ان کے بندھے ہاتھوں کو چوم کر اس نے آنکھوں سے لگایا اور ان کی روح تک میں ٹھنڈک اتر گئی۔

وہ بہت دیر تک اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتے رہے، اس کی بچپن کی، اس کے خوابوں کی خواہشوں کی وہ سنتی رہی، وہ پرسکون ہوئی تو آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں، وہ محسوس کرتے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے کھڑے ہو گئے۔

"ختم کر دیں اس دشمنی کو آغا جان! جس کی بھینٹ میری ماں چڑھی۔" وہ یکدم ہی ان کا ہاتھ تھامتے کہہ گئی۔

"تمہاری ماں مجھے بابا جان کہا کرتی تھی مجھے اچھا لگے گا اگر تم نانا جان کہو۔" وہ اس کا گال تھپتھپاتے کھڑے ہو گئے۔

☆.....☆

وہ ٹیرس پر کھڑی ادھورے چاند کا نظارہ کر رہی تھی، کل عید الاضحیٰ تھی اور آج کشمالہ کی بات پکی ہوئی تھی، رمیز شاہ کے ساتھ لڑائیاں، جنگیں کسی کو کچھ عطا نہیں کرتیں۔ بس بہت سا قیمتی خون اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔ آغا جان کی سمجھ میں بات آ گئی تھی اور یہی بات سمجھانے وہ شاہ ہاؤس گئے تھے۔ اپنے بیٹوں کی مخالفت کے باوجود نئی پود ان کے ساتھ تھی۔ سو بیٹوں کی مخالفت کی انہیں زیادہ پروا نہ تھی۔ انہیں لگا تھا کہ شاہوں کو یہ بات سمجھانے میں بہت وقت لگے گا کہ برسوں کی دشمنیاں یونہی ختم نہیں ہو جاتیں، مگر شاید وہ بھی برسوں سے جاری اس جنگ سے بیزار تھے، آغا کریم کی اپیل نے اس دشمنی کو ختم کیا تھا، انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا اور دو دن بعد دشمنی سے تبدیل ہوئی نئی نئی دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے پوری چاہت اور خلوص سے شاہوں کی حویلی سے کشمالہ کا رشتہ آیا تھا۔

سلطان خان کو جو اعتراض تھا وہ ان کا سلوک اور چاہت دیکھ کر ختم ہو گیا تھا، سو مشاورت کے بعد اثبات میں جواب پہنچا دیا گیا اور آج پوری رسم و رواج اور چاؤ سے کشمالہ کی منگنی کی رسم کی گئی تھی، وہ قصاص میں دی جانے والی لڑکی نہیں تھی بلکہ شاہوں کی بڑی بہو بننے جا رہی تھی اور وہ پوری عزت و پیار کے ساتھ اس پر مہر لگانے آئے تھے۔

جہان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کرتے فون اس کی طرف بڑھایا تھا۔ "دادی کا فون ہے۔" وہ اس کے ہاتھ سے فون لیتی پرجوش انداز میں آج کی تقریب کا حال سنانے لگی تھی۔ جہان نے مسکراتے ہوئے اس کی چھوڑی ہوئی چائے کا کپ لبوں سے لگایا تھا۔ جہاں آراء بیگم کی تج روانگی سے قبل وہ انہیں اپنے بارے میں بتا چکا تھا اور انہیں مطمئن بھی کر چکا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد اس نے فون اسے تھمایا اور چائے کا کپ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر خالی کپ دیکھ کر وہ بس اسے گھور کر رہ گئی، اس نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میں تم پر ابھی یہ بار نہیں ڈالنا چاہتا، تم سکون سے اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرو، اس کے لیے تم ابھی چھوٹی ہو۔" اس کا اشارہ اس کی پریگننسی کی طرف تھا۔

"بس کر دیں، اب میں کوئی اتنی بھی چھوٹی نہیں ہوں، دو مہینے بعد پورے انیس سال کی ہو جاؤں گی۔" تنک کر کہتے وہ اس کے بازو کے حصار سے نکلی تھی، اس کے لیے تو یہ خوشی کا مقام تھا۔ جہان جیسے سخت گیر ٹیچر سے اس کی جان چھوٹ رہی تھی۔

"ہمم..... فزیکلی.... بٹ مینٹلی۔" جہان نے شرارت سے اسے دیکھا اس کا منہ پھول کر کپا ہو گیا۔

"او کے... او کے آپ کو بڑا تسلیم کرنا ہی پڑے گا اب تک بڑے بڑے کام کیے ہیں آپ نے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سیز فائر کیا تھا۔ شانی کے چہرے پر فخریہ مسکراہٹ سج گئی۔ آگے بڑھ کر اس کے شانے پر سر رکھا۔

"پتا نہیں میرے ہیرا اور بھورا کیا کر رہے ہونگے؟" جہان نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

"صبح قربان ہونے کی تیاری اور کیا.....؟ ویسے تم فکر نہ کرو، میں جمشید صاحب سے کہہ کر پکچر واٹس ایپ کرا لوں گا، تم آخری دیدار کر لینا۔" اثبات میں سر ہلاتے اس نے نظریں ایک بار پھر چاند پر جمائی تھیں جہان نے اس کے نظروں کے تعاقب میں دیکھا ادھورا چاند ہر روشنی بکھیر رہا تھا۔

صبح بس کچھ ہی دور تھی مگر اس علاقے پر تو سورج طلوع ہو چکا تھا، ظلم کے گہرے سائے چھٹ چکے تھے اب کوئی لڑکی ان رسوم و رواج کی بھینٹ نہیں چڑھنی تھی کسی کو اپنے گھر کے مردوں پر قربان نہیں ہونا تھا، ماضی اگرچہ تلخ تھا مگر حال اور مستقبل روشن تھا۔ شانی نے گردن اٹھا کر پیار سے اس شخص کو دیکھا اور سر دوبارہ اس کے شانے پر ٹکا دیا، جہان نے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد تنگ کر دیا تھا۔